ئی۔ اگست ۱۹۶۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ: ساٹھ پیسے
سالانہ: چھ روپے (بارہ شلنگ

MEESAAQ. Regd. No. L. 7360

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۷	صفر و ربیع الاول ۱۳۸۲ھ	شمارہ ۲، ۳

فہرست مضامین

مضمون	مصنف	صفحہ
تذکرہ و تبصرہ	امین احسن اصلاحی	۲
تدبر قرآن		
تفسیر سورۂ بقرہ	〃	۸
مطالعۂ حدیث		
حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم	مولانا عبد الغفار حسن صاحب	۱۶
افادات فراہی		
اصول تفسیر -۳-	جناب خالد مسعود صاحب	۲۴
مقالات		
اسلام اور انسانی حقوق	مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی	۳۲
اقتباسات و تراجم		
تہذیب مغرب کا ثمرہ - کثرت طلاق	جناب خالد مسعود صاحب	۴۲
نبی کا فیضان نظر	〃	۴۸
تقریظ و تنقید		۵۱

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
مینیجر ماہنامہ میثاق
رحمان پورہ - اچھرہ - لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیل زر کا پتہ
مینیجر ہفت روزہ ندائے ملت
باغ گونگے نواب - لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

سخت ندامت اور افسوس ہے کہ جولائی کا میثاق وقت پر شائع نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ راقم سطور جون کے آخر میں گردے کی تکالیف میں مبتلا ہو گیا۔ اور اب تک ان تکالیف کا سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ یہ گردے کا عارضہ میرے پچھلے عوارض میں ایک نیا اضافہ ہے اور اس کا خاص اثر جو مجھ پر ہوا وہ یہ ہے کہ اس دوران میں لکھنے پڑھنے کا کام تقریباً بند رہا۔ میثاق کی ترتیب میں اگرچہ رفیق عزیز — خالد مسعود صاحب — حفظہ اللہ میرا ہاتھ بٹاتے ہیں لیکن ابھی وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتے کہ تنہا اپنی ذمہ داری پر اس کا کوئی شمارہ شائع کریں۔ اس صورت حال کی وجہ سے جولائی کا پرچہ مؤخر ہوتا گیا، یہاں تک کہ اگست کا مہینہ آگیا۔ اب مزید تاخیر کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے پرچہ جوں توں مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس میں جو مضامین دیئے جا رہے ہیں ان پر میں نظر نہیں ڈال سکا ہوں۔ یہاں تک کہ تفسیر کے صفحات بھی مسودے سے نکال کر بغیر میری نظر ثانی ہی کے دے دیئے گئے ہیں۔ اس کوتاہی اور بے قاعدگی کے سبب سے رسالے کے خریداروں کو جو شکایت ہوئی ہے وہ ایک بالکل قدرتی چیز ہے۔ اس کا احساس جتنا مجھے ہے شاید ہی کسی دوسرے شخص کو ہو۔ لیکن حالات پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسے اختیار حاصل ہے! میں رسالہ کی اشاعت کو منظم کرنے کے لئے ایک ایسے مددگار کی ضرورت شدت سے

محسوس کر رہا ہوں جو اپنا پورا وقت اس کے لئے دے سکیں۔ لیکن یہ بات اس وجہ سے ممکن نہ ہو سکی کہ پرچہ اب تک اپنے ناگزیر مصارف طباعت و اشاعت بھی پورے کرنے کے قابل نہیں ہو سکا ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جو اس کے قدردانوں کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس پرچہ کو باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے قدردان اس کا حلقہ اشاعت اپنے اپنے دائرہ اثر کے اندر کچھ بڑھانے کی کوشش کریں۔ اس کے بغیر اس قسم کے علمی و مذہبی پرچے کا جاری رہنا ممکن نہیں ہے۔

جولائی کے پرچہ کا جو نقصان اس کے خریداروں کو اٹھانا پڑا ہے اس کی تلافی انشاء اللہ اس ششماہی میں کسی نہ کسی شکل میں ضرور کر دی جائے گی۔ یا تو ہر شمارے کا حجم بقدر ایک ایک کاپی کے بڑھا دیا جائے گا یا کسی ایک شمارے کا حجم دگنا کر دیا جائے گا۔

(۲)

نئے دستور کے نفاذ کے بعد سے اس ملک میں جو حالات پیش آئے ہیں وہ ہمارے نزدیک کسی پہلو سے بھی خوش آئند نہیں ہیں۔ اجتماعی و سیاسی زندگی میں ہمارے جو عناصر حصہ لیتے ہیں۔ ان میں سے بلا استثناء سبھی کا رول نہایت مایوس کن رہا ہے۔ جو لوگ اہل سیاست کے نام سے معروف ہیں انہوں نے اس دوران میں جس غیر ذمہ داری اور ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دیا ہے اور برابر دیئے پر مصر ہیں اس سے ایک عام آدمی بھی اس نتیجہ تک پہنچتا ہے کہ اس ملک میں جمہوریت کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ ارباب اقتدار نے جو روش اختیار کی ہے اس سے ان توقعات کی قریباً کمر ٹوٹ گئی ہے جو صدر ریاست کی طرف سے از خود ایک دستور کے نفاذ اور مارشل لا کے ختم کئے جانے سے بہت سے دلوں میں پیدا ہو گئی تھیں۔ بالخصوص مشاورتی کونسل کی تشکیل جس شکل میں ہوئی ہے اس کو دیکھنے کے بعد تو ان حضرات سے اسلام کے باب میں کوئی اچھی توقع کرنا محض خوش فہمی ہی ہوگی۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس کونسل کی تشکیل کرتے وقت بہت دور تک سوچ کر اس بات کے لئے پیش بندی کی گئی ہے کہ مبادا اس کی وجہ سے ان کو اسلام کی کوئی بات قبول کرنے کی زحمت میں مبتلا ہو جانا پڑے۔ اگرچہ انتخاب صدر

ریاست کی ایسی ہی صواب دید پر مبنی ہے تو ہم اس پر ان کو مبارکباد نہیں دے سکتے۔ ہمیں ان سے اس سے کہیں بہتر انتخاب کی امید تھی اور اگر اس انتخاب میں دوسروں کے مشورے کو دخل ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ انہوں نے اس مشورے سے صدرِ ریاست کے وقار و اعتماد اور ملک کے مستقبل کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ جو لوگ منتخب کئے گئے ہیں ہم ان شریف آدمیوں کو زیرِ بحث لا کر بے ضرورت ان کو مجروح نہیں کرنا چاہتے لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پیشِ نظر مقصد کے لئے ان میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر کوئی شخص بھی اپنے اندر کوئی موزونیت نہیں رکھتا۔ اس کونسل کے قیام سے مقصود بہر حال اسلام کے خلاف کوئی سازش کرنا نہیں ہے بلکہ ملک کے سامنے پیش آنے والے پیچیدہ مسائل میں اس سے یہ فتویٰ حاصل کرنا ہے کہ ان مسائل میں اسلام کیا رہنمائی دیتا ہے۔ اگر خوفِ خدا نہیں تو کم از کم دنیا کو دکھانے ہی کے خیال سے اس میں کچھ ایسے لوگوں کو شامل کرنا ضروری تھا جو اس کام کے اہل تھے تاکہ دستور کی اتنی اہم چیز جس سے نہ جانے کتنی امیدیں وابستہ تھیں لوگوں کی نظروں میں بالکل مذاق بن کے نہ رہ جاتی۔ اپنے اس انتخاب کی تصویب میں محترم صدرِ ریاست اور ہمارے وزیرِ خارجہ صاحب نے یہ جو فرمایا ہے کہ ایسے لوگ کہاں مل سکتے ہیں جن پر کسی کو اعتراض نہ ہو، یہ ایک بالکل ہی پا در ہوا بات ہے جو محض لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے کہی جا رہی ہے۔ ورنہ آخر یہ مطالبہ کس نے کیا تھا کہ اس کونسل میں وہ لوگ لئے جائیں جن پر کسی کو اعتراض نہ ہو۔ لوگوں کا مطالبہ معصوم صفت انسانوں کے لئے نہیں تھا بلکہ ایسے اشخاص کے لئے تھا جو اسلامی شریعت میں بصیرت رکھنے والے، حالات و مسائل کو سمجھنے والے اور ملک کی اکثریت کے نزدیک قابلِ اعتماد ہوں۔ اگر اربابِ اقتدار کو اصل ضرورت کی اہمیت اور مسلمانوں کے احساسات کا اندازہ ہوتا تو اس قوم کے اندر سے مذکورہ صفات کے اشخاص کا تلاش کر لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اب اگرچہ کوئی مشورہ پیش کرنا بعد از وقت ہے لیکن از روئے دستور چونکہ اس فہرست میں اضافہ کی گنجائش موجود ہے اس وجہ سے ہم صدرِ ریاست کی خدمت میں یہ عرض کریں گے کہ مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا داؤد غزنوی صاحب، مولانا مودودی صاحب اور مولانا اطہر علی صاحب کو اس کونسل میں ضرور شامل کیا جائے۔ علماء کے طبقے سے جب تک

ان حضرات کے درجے کے اشخاص نہیں لئے جائیں گے نہ تو کونسل کے اندر توازن قائم ہو سکے گا اور نہ مسلمانوں کی نظر میں اس کونسل کی اور اس کے مشوروں کی کوئی وقعت ہوگی۔

(۳)

اخبارات میں میرے اور میرے بعض دوستوں سے متعلق یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ ہم مستقبل قریب میں ایک مذہبی و سیاسی پارٹی کی تشکیل کے لئے اپنے ہم خیالوں کی ایک کونشن بلا رہے ہیں۔ اس اطلاع کی بنا پر لوگ بکثرت خطوط کے ذریعہ سے بھی اس پارٹی کے متعلق استفسار کر رہے ہیں اور قریب کے لوگ بالمشافہ گفتگو کے لئے بھی مجھ سے مل رہے ہیں۔

تمام مستفسرین کے خطوط کا الگ الگ جواب دینا چونکہ بہت مشکل ہے اس وجہ سے ان صفحات کے ذریعہ سے اطلاع دی جاتی ہے کہ یہ خبر ہماری طرف سے اخبارات کو نہیں بھیجی گئی ہے بلکہ یہ اے پی پی نے خود پھیلائی ہے اور یہ زیادہ تر اس کے اپنے ہی قیاسات اور اندازوں پر مبنی ہے جس کے سبب سے اس میں صحیح اور غلط دونوں قسم کے اندازے شامل ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کچھ احباب مجتمع ہوئے تھے اور انھوں نے ان تمام حالات و مسائل کا جائزہ بھی لیا جن سے مارشل لاء اٹھنے کے بعد ہماری قوم دوچار ہے۔ ہم میں سے اکثر نے اس خلا کو بھی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا جو اس وقت ایک صحیح قسم کی دینی جماعت کے میدانِ عمل میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے یہاں نمایاں ہے۔ اس سلسلہ میں میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ اس ملک میں جو لوگ اسلام کے لئے کام کرنے اٹھے تھے وہ اہلِ سیاست کے ہاتھوں میں بالکل کھلونا بن کے رہ گئے ہیں اور اہلِ سیاست کشمکشِ اقتدار کی جنگ میں ان کے نعروں اور ان کے مسائل کو اپنے حریفوں کے خلاف اینٹ پتھر کے طور پر پوری بیدردی کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔

یہ صورتِ حال اسلام کے حق میں نہایت خطرناک ہے۔ اہلِ دین جب دنیا طلبوں کے چکر میں پھنس کر ان کی گاڑی کھینچنے لگتے ہیں تو پھر وہ دین کو بازیچۂ اطفال اور دنیا کی نگاہوں میں اس کو ایک مذاق بنا کے رکھ دیتے ہیں ـــ یہ صورتِ حال آج ہر صاحبِ نظر کے سامنے موجود ہے اور یہ ہمارے سامنے بھی موجود رہی ہے اور اسلام کے خدمت گزار ہونے کے پہلو سے ہم نے اس پر غور بھی کیا اور اس کا حل بھی معلوم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہر شخص اندازہ کر

سکتا ہے کہ اس طرح کے اہم مسائل رواروی میں طے کرنے کے نہیں ہوتے۔ جماعتوں کی تنظیم نہ تو کوئی آسان کام ہے اور نہ اس وقت تک یہ مفید ہے، جب تک اس کے لئے کوئی شدید ملی ضرورت داعی نہ ہو۔ ابھی یہ کہنا قبل از وقت ہے کہ ہم نے جن مسائل پر غور کیا ہے، ان کے بارے میں کسی قطعی فیصلہ تک پہنچ چکے ہیں۔ اگر ایسی صورت ہوتی تو ہم ضروری معلومات خود اجلاس سے بیشتر فراہم کرتے، اس وجہ سے لوگ محض قیاسی اطلاعات کی بنا پر نہ تو کسی خوش گمانی میں مبتلا ہوں نہ کسی بدگمانی میں۔ اگر کسی جماعت کی تشکیل عمل میں آئی تو وہ بہر حال ملت کی کسی اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے عمل میں آئے گی اور اسلام کی کوئی خدمت انجام دے گی۔ اس کے قیام سے مقصود نہ تو یہ ہو سکتا کہ قائم شدہ جماعتوں میں ایک اضافہ کیا جائے اور نہ کسی کی بے فائدہ مخالفت یا موافقت۔

(۴)

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیۃ علمائے ہند کے ناظم مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لئے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشۂ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت کے اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں وہ تو اس حادثہ کی اہمیت کا کما حقہٗ اندازہ نہیں کر سکیں گے لیکن جو لوگ بھارت کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انہیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لئے ان کے اس دور ابتلا میں کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انہوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانشمندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ میرا ذاتی تاثر یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انہیں میسر آئی اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا۔ انہوں نے ملک کی مشترک جد و جہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اثر تھا۔ انہوں نے اپنے اس پورے

اثر کو بالکل بے لوث اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالٰے مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے، پوری قوم کی طرف سے ان کو جزائے خیر دے اور بھارت کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو خدمت وہ کر رہے تھے اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالٰے مولانا کی مغفرت فرمائے۔ اب یہ دعائے مغفرت ہی وہ سوغات ہے جو اس مجاہد ملت کے لئے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں۔ ہم میثاق کے تمام ناظرین سے بھی مولانا کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

(۵)

علم قرآن کے چند شائقین کے اصرار پر میں نے قرآن مجید کے تحقیقی نوعیت کے درس کے لئے "حلقۂ تدبر قرآن" کے نام سے ایک حلقہ قائم کر دیا ہے۔ خاص چیز جو اس حلقہ کے قیام کے لئے محرک ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ عمر تیزی کے ساتھ گزرتی جا رہی ہے اور میری تفسیر تدبر قرآن ابھی اپنے ابتدائی مراحل سے بھی آگے نہیں بڑھی ہے۔ نہیں معلوم پیش نظر نقشہ کے مطابق اس کی تکمیل کی فرصت ملتی ہے یا نہیں۔ یہ کام خاصا لمبا کام ہے۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ اس کے ساتھ ساتھ ایک حلقہ درس قائم کر کے کچھ ذہین و ذی استعداد طلبہ کو اس طرز فکر کی تربیت بھی دی جائے جو اس تفسیر میں اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اللہ کا نام لے کر میں نے درس کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور چند طلبہ روزانہ پابندی کے ساتھ درس لے رہے ہیں۔ انگریزی اور عربی مدارس کے طلبہ میں سے جو طلبہ علم قرآن کا شوق رکھتے ہیں اور پابندی کے ساتھ اس کام کے لئے کچھ وقت نکال سکتے ہیں وہ اس حلقہ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ طلبہ کے علاوہ جو حضرات جدید یا قدیم تعلیم پائے ہوئے ہیں اور اس قسم کے کاموں کے لئے کچھ فرصت و فراغت رکھتے ہیں وہ اس حلقہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ثابت ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ پابندی اور التزام کے ساتھ اس کام کے لئے تھوڑا سا وقت روز نکال سکیں۔ جو حضرات اس حلقہ میں شریک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں وہ عصر اور مغرب کے درمیان دفتر میثاق سے اس کے اوقات کار معلوم کر لیں۔

مستدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۲۷)

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرٰهِيمُ الْقَوَاعِدَ ...... السَّمِيعُ الْعَلِيمُ | قواعد، قاعدہ کی جمع ہے۔ قاعدہ کے معنی بنیاد اور اساس کے ہیں۔ اوپر والی آیت میں اس گھر کی تعمیر کے حکم کا حوالہ تھا اب آگے یہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ اس کی بنیادیں اٹھاتے وقت حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے کیا دعا کی تھی اس گھر کے ساتھ ان کی کیا آرزوئیں اور تمنائیں وابستہ تھیں اور مستقبل میں اس سے کس فیض عام کے جاری ہونے کی انھوں نے اپنے پروردگار سے التجا کی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کی سرگذشت کا یہ حصہ صرف قرآن کے ذریعہ سے ہمارے علم میں آیا ہے، اس لئے کہ یہود نے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، تورات سے خاص اس حصہ کو یا تو حذف کر دیا یا اس میں اپنے حسب منشا تحریف کر دی، لیکن یہ آپ کی سرگزشت کا ایک ایسا ضروری حصہ ہے کہ اس کے بغیر یہ بالکل ناتمام معلوم ہوتی ہے۔ قرآن نے یہ تحریف کردہ حصہ بے نقاب کر کے اس کی تکمیل کر دی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ اے ہمارے رب ہماری طرف سے قبول کر۔ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تیری عبادت اور تیری بندگی کی دعوت کے لئے یہ گھر جو ہم بنا رہے ہیں اس کو شرف قبولیت بخش اور ہماری یہ خدمت قبول فرما اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ہم تیرے گھر کی بنیادیں اٹھاتے وقت کچھ التجائیں پیش کرتے ہیں، ہماری یہ التجائیں قبول فرما۔ ہم اس دوسرے مطلب کو ترجیح دیتے ہیں، اول تو اس وجہ سے کہ اس صورت میں یہ جملہ خاص خانہ کعبہ سے متعلق ہونے کے بجائے اس پوری

دعا کی تمہید بن جاتا ہے جو آگے آ رہی ہے، دوسرے جہاں تک خانہ کعبہ کی تعمیر کا تعلق ہے یہ کام حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق کر رہے تھے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اس وجہ سے اس کی قبولیت پہلے سے معلوم تھی۔ انک انت السمیع العلیم میں خدا کی ان دو صفتوں کا حوالہ ہے، جن پر اعتماد کر کے بندہ خدا سے دعا کرتا ہے اور اس کے اندر حصر کا جو مضمون ہے وہ دعا کرنے والوں کی طرف سے کامل سپردگی اور کامل اعتماد کا اظہار ہے۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ...... التَّوَّابُ الرَّحِيمُ | دعا کے بیچ بیچ میں بار بار "ربنا" کا اعادہ اور دعا کے مناسب صفات الٰہی کا حوالہ دعا کے آداب میں سے ہے۔ اس سے دعا شرف قبولیت حاصل کرتی ہے۔ یہ دعا ان دونوں چیزوں کے حکیمانہ استعمال کی بہترین مثال ہے۔

سب سے پہلے باپ بیٹے دونوں نے جس چیز کی دعا کی ہے وہ خود اپنے مسلم بنائے جانے کی ہے۔ مسلم کے معنی خدا کے کامل فرمانبردار کے ہیں۔ اس سے کئی حقیقتیں روشنی میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان و اسلام اور طلب تثبیت و تقویت کی دعاؤں میں انسان سب سے پہلے اپنے آپ کو سامنے رکھے۔ یہ چیزیں ایسی نہیں جن سے کوئی بھی مستغنی ہو سکے اگرچہ وہ کتنا ہی عالی مقام پر ہو۔ دوسری یہ کہ اسلام کے درجات و مراتب کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ جیسے مسلم کامل بھی جن کے ذریعہ سے دنیا اسلام کے نام اور اس کی روح سے آشنا ہوئی، اپنے مسلم بنائے جانے کے لئے دعا کرتے تھے۔ تیسری حقیقت، جو خاص اس موقع سے تعلق رکھنے والی اور نظم کلام کو کھولنے والی ہے، یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی زندگی کے سب سے زیادہ تاریخی موقع پر جب کہ وہ اپنے عشق کا مرکز تعمیر کر رہے تھے، اپنے لئے جس چیز کی دعا کی تھی، مسلم بنائے جانے کی تھی، نہ کہ یہودی یا نصرانی بنائے جانے کی۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ۔ اپنے مسلم بنائے جانے کی دعا کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنی ذریت کے اندر سے ایک مسلم امت اٹھائے جانے کی بھی اس موقع پر دعا فرمائی۔ اس دعا میں چونکہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی ذریت میں سے صرف حضرت اسمٰعیلؑ شریک تھے۔ اس وجہ سے اس کا واضح مفہوم یہی ہو سکتا ہے کہ یہ انہی کی اولاد سے متعلق تھی چنانچہ انہی کی نسل کے اندر محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور آپ کی

دعوت ہے وہ امت مسلمہ ظہور میں آئی جس کے لیے یہ دعا کی گئی تھی۔ تورات سے یہ چیزیں تو غائب کر دی گئیں لیکن قربان ہونے والے فرزند سے متعلق یہ پیشینگوئی موجود ہے کہ "تیری نسل کے ذریعے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی"۔

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۔ "اَرِنَا" کے اصل معنی "ہمیں دکھا" کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور اپنی شریعت کی طرف اپنے بندوں کی رہنمائی اس طرح کی وحی کے ذریعے بھی کرتا ہے جس کا مظہر قرآن مجید ہے اور کبھی خواب یا کشف میں یا براہ راست یا کوئی فرشتہ بھیج کر اس کام کو عملاً دکھا یا بتا بھی دیتا ہے جو مطلوب ہوتا ہے۔ اس قسم کی رہنمائی قرآن مجید کی اصطلاح میں اراءت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی رہنمائی زیادہ تر اراءت ہی کے ذریعے سے ہوتی تھی۔ یعنی یا تو رویا میں ان کو ایک بات دکھا دی جاتی تھی یا کوئی فرشتہ خداوندی ظاہر ہو کر مطلوب کام کی طرف راہنمائی کر دیتا تھا۔ تورات سے اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہاں دعا میں حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے اسی اراءت کی درخواست کی ہے۔

مناسک، منسک کی جمع ہے۔ نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ نَسَكَ الثَّوبَ کے معنی ہیں کپڑے کو دھو کر پاک کیا۔ اسی سے نُسُک ہے جس کے معنی قربانی کے ہیں، قربانی چونکہ آدمی کو گناہ کی آلودگیوں اور آلائشوں سے پاک کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب عطا کرتی ہے۔ پھر اسی سے منسک ہے جس کے معنی قربانی کے طریقہ کے بھی ہیں اور قربان گاہ کے بھی۔ اس کی جمع مناسک ہے جو حج کے تمام سلسلہ عبادات و مراسم پر حاوی ہے۔ فرمایا ہے۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ... (بقرہ ۲۰۰) (جب تم حج کے مراسم ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو)۔

وَتُبْ عَلَيْنَا۔ توبہ کے اصل معنی رجوع کرنے اور متوجہ ہونے کے ہیں۔ اس کا صلہ جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو یہ جیسا کہ آیت ۳۷ کی وضاحت کرتے ہوئے ہم بیان کر چکے ہیں اس بات پر دلیل ہوتا ہے کہ اس کے اندر رحم کا مضمون پوشیدہ ہے۔ رحم کے اس پوشیدہ مضمون کو یہاں اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ کہہ کر کھول بھی دیا ہے۔ بندہ جب اپنے رب کی طرف خشیت کے ساتھ رجوع کرتا ہے تو رب رحیم رحمت کے ساتھ بندے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ ...... اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔ ان میں انہی میں سے ایک رسول اٹھا، یعنی ہماری ذریت میں سے۔ چونکہ اس موقع پر حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ صرف حضرت اسمٰعیلؑ ہی تھے اور وہی اس وادی غیر ذی زرع میں بسائے جا رہے تھے اس وجہ سے اس دعا کا تعلق لازماً انہی کی ذریت سے تھا۔ اس کا کوئی تعلق بھی حضرت اسحٰقؑ کی ذریت سے نہیں ہو سکتا۔ تورات کے الفاظ سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ آخری نبیؐ کی بعثت حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل سے ہونے والی تھی۔ استثنیٰ باب ۱۸ میں حضرت موسیٰؑ کی جو مشہور پیشینگوئی ہے اس میں فرمایا ہے "تیرے ہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کرے گا" آگے چل کر ہے "میں ان کے لئے انہیں کے بھائیوں میں سے" کے الفاظ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ اس سے مراد بنی اسمٰعیل ہی ہیں۔ اگر بنی اسرائیل مراد ہوتے تو صحیح تعبیر "انہی کے بھائیوں میں سے" کے بجائے "انہی میں سے" کی ہوتی اسی طرح "تیرے ہی بھائیوں میں سے" کی جگہ "تمہارے ہی اندر سے" کے الفاظ وارد ہوتے۔ علاوہ ازیں یہاں "تیری مانند" کے الفاظ بھی قابل لحاظ ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس نبی کی بعثت کی پیشینگوئی کی گئی تھی، ایک صاحب رسالت رسول کی تھی۔ قرآن مجید کی مذکورہ دعا میں اسی لحاظ سے رسول کا لفظ وارد ہوا ہے۔ ہم آگے کسی مناسب موقع سے رسول اور نبی کے فرق کو ظاہر کریں گے۔

یہاں جس رسول کی بعثت کے لئے دعا کی گئی ہے اس کے تین مقصد بتائے گئے ہیں، ایک تلاوت آیات، دوسرا تعلیم کتاب و حکمت، تیسرا تزکیہ۔

آیت لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جا سکے۔ اس پہلو سے آسمان و زمین کی ہر چیز آیت ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر چیز خدا کی قدرت و حکمت اور اس کی مختلف صفات خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح وہ معجزات بھی آیت ہیں جو انبیاء علیہم السلام سے ظاہر ہوئے اس لئے کہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علیٰ ہذا القیاس قرآن مجید کے الگ الگ جملوں کے لئے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس لئے کہ فی الحقیقت ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل و برہان کی ہے جس سے خدا کی صفات اور اس کے احکام و قوانین اور اس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے۔

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ کے الفاظ سے اس زور اور اختیار کا اظہار ہو رہا ہے جس سے مسلح

ہو کر خدا کا ایک رسول اس دنیا میں آتا ہے۔ یہ واضح رہے کہ رسول محض ایک خوش الحان قاری کی طرح لوگوں کو قرآن سنانے نہیں آتا۔ بلکہ وہ خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے لوگوں کو آسمان و زمین کے خالق و مالک کے احکام و فرامین اور اس کے دلائل و براہین سے آگاہ کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وحی الٰہی کے لئے آیات کے لفظ سے اس حقیقت کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ خدا کا دین تحکم اور جبر پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام تر دلائل و براہین پر مبنی ہے اور اس کے ہر ٹکڑے کے اندر اس کی دلیل ہے۔

اب آئیے تعلیم کتاب و حکمت کے الفاظ پر غور فرمائیے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ تعلیم تلاوت سے ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ تلاوتِ آیات تو یہ ہوئی کہ رسول نے لوگوں کو آگاہ کر دیا کہ خدا نے اس کے اوپر یہ وحی نازل کی ہے۔ تعلیم یہ ہے کہ نہایت شفقت و توجہ کے ساتھ ہر استعداد کے لوگوں کے لئے اس کی مشکلات کی وضاحت کی جائے، اس کے اجمالات کی تشریح کی جائے، اس کے مقدرات کھولے جائیں اور اس کے مضمرات بیان کئے جائیں اور اس توضیح و بیان کے بعد بھی اگر لوگوں کے ذہن میں سوالات پیدا ہوں تو ان کے سوالوں کے جواب دیئے جائیں۔ مزید براں لوگوں کی ذہنی تربیت کے لئے خود ان کے سامنے سوالات رکھے جائیں اور ان کے جوابات معلوم کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ لوگوں کے اندر فکر و تدبر کی صلاحیت اور کتاب الٰہی پر غور کرنے کی استعداد پوری طرح بیدار ہو جائے۔ یہ ساری باتیں تعلیم کے ضروری اجزا میں سے ہیں اور ہر شخص جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کیا ہے اس بات سے اچھی طرح واقف ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کے لئے تعلیم کتاب کے یہ تمام طریقے اختیار فرمائے۔

تعلیم کے ساتھ یہاں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا، دوسری حکمت کا۔ کتاب سے مراد تو ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے اس لفظ کی تحقیق ہم اس سورہ کی آیت ۲ کی تفسیر کے ذیل میں بیان کر آئے ہیں۔ لفظ حکمت کی تحقیق مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں جو بیان فرمائی ہے اس کا ضروری حصہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"عربی حکمت تو وہ تعبیر ہے اس قوت و صلاحیت کی جس سے انسان معاملات کا فیصلہ حق کے مطابق کرتا ہے۔ حضرت داؤد کی تعریف میں ارشاد ہوا ہے واتیناہ الحکمۃ

وفصل الخطاب (ہم نے اس کو حکمت عطا کی اور فیصلۂ معاملات کی صلاحیت) یہاں فصل الخطاب کے لفظ سے اس اثر کو بیان کیا ہے جو حکمت کا ثمرہ ہے، جس طرح فیصلہ معاملات کی صلاحیت حکمت کے ثمرات میں سے ہے اسی طرح اخلاق کی پاکیزگی اور تہذیب بھی اس کے ثمرات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اہل عرب حکمت کا لفظ انسان کی اس قوت و صلاحیت کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں جو عقل و رائے کی پختگی اور شرافت اخلاق کی جامع ہوتی ہے، چنانچہ دانشمند اور مہذب آدمی کو حکیم کہا جاتا ہے اور جو بات عقل اور دل دونوں کے نزدیک بالکل واضح ہو اس کو حکمت سے تعبیر کرتے ہیں۔"

حکمت کا ذکر یہاں کتاب کے ساتھ اس بات پر دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے ایک زائد شے ہے، اگرچہ یہ حکمت سر تا سر قرآن حکیم ہی سے ماخوذ و مستنبط ہو۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک جو لوگ حکمت سے حدیث مراد لیتے ہیں، ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔ یہاں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ حکمت چونکہ حکیمانہ بات کو بھی کہتے ہیں اور حکیمانہ بات کہنے کی صلاحیت کو بھی۔ اس وجہ سے تعلیم حکمت کے معنی جس طرح کسی کو کوئی حکیمانہ بات بتا دینے کے ہیں اسی طرح اس کے معنی لوگوں کے اندر حکمت کی صفت و صلاحیت پیدا کرنے کے بھی ہیں۔

رسول کا تیسرا مقصد تزکیہ بتایا گیا ہے۔ لفظ تزکیہ دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک پاک صاف کرنے پر، دوسرے نشو و نما دینے پر۔ ہمارے نزدیک یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جو چیز مخالف و مزاحم زوائد و مفاسد سے پاک ہوگی وہ لازماً اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پروان بھی چڑھے گی۔ انبیاء علیہم السلام نفوس انسانی کا جو تزکیہ کرتے ہیں اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں اور ان کے اعمال و اخلاق کو غلط چیزوں سے پاک صاف بھی کرتے ہیں۔ اور ان کے اعمال و اخلاق کو نشو و نما دے کر ان میں مفاسد اور مخالف و مزاحم چیزوں کے بالمقابل استقلال کے ساتھ سینہ سپر رہنے اور استقامت دکھانے کی قوت بھی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کتاب کے مقابلہ میں نفوس کا تزکیہ کہیں زیادہ دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاضت کا طالب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کا ذکر تمام دین و شریعت کے غایت و مقصد کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت ہم

انشاء اللہ آگے کسی موزوں مقام پر کریں گے۔

آیت کے اجزاء کی وضاحت کے لئے یہ تفصیل یہاں کافی ہے، اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے تمام مقاصد نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، اور مزید کسی تفصیل کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن اس زمانہ میں منکرین حدیث نے رسالت کے ان تینوں مقاصد میں سے صرف ایک مقصد تلاوت آیات کو تو لے لیا ہے اور بقیہ دو کی نفی کر دی ہے، اس وجہ سے ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر مزید گفتگو کی جائے چنانچہ آگے مستقل عنوان سے ہم اس کے بعض دوسرے گوشوں پر بھی روشنی ڈالیں گے۔

آیت کے خاتمہ پر خدا کی دو صفتوں، عزیز اور حکیم —— کا حوالہ ہے، عزیز کے معنی غالب اور عزت و قوت والے کے ہیں، یعنی وہ ذات جو پوری قوت و صولت اور پورے اختیار و اقتدار کے ساتھ اس کائنات پر فرماں روائی کر رہی ہے، حکیم کے معنی ہیں جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد و غایت ہو، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ان دونوں صفتوں کا حوالہ بالعموم ایک ساتھ آتا ہے، اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبہ کے ساتھ حاوی اور متصرف ہے، لیکن اس کے اس غلبہ و اقتدار کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس کے زور میں جو چاہے کر ڈالے، بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت و مصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا کوئی کام بھی حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔

یہاں ان دونوں صفتوں کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جو خدا عزیز و حکیم ہے، اس کی عزت و حکمت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی پیدا کی ہوئی اس مخلوق میں اپنا سفیر و پیغمبر بھیجے جو اس کی رعیت کو اس کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ .... لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ | رَغِبَ، کا صلہ جب عن کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی چیز سے بے رغبت اور بیزار ہونے کے ہوتے ہیں۔

سَفِہَ زیادہ تر لازم آتا ہے لیکن متعدی بھی آتا ہے، مثلاً سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنا نصیبہ بگاڑ لیا، سَفِہَ رَأْیَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے احمقانہ رائے اختیار کی، اسی طرح

سَفِہَ نَفْسَہٗ کے معنی ہوں گے اس نے اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کیا۔

یہ اسلوب کلام اظہار تعجب اور اظہار افسوس دونوں کا جامع ہے، اشارہ یہاں یہود کی طرف ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ ملت ابراہیم کے پیرو ہونے کے مدعی ہیں، بلکہ اپنے زعم میں اس کے واحد اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں، دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ جو پیغمبر ملت ابراہیم کا داعی بن کر آیا ہے اس سے اور اس کی دعوت سے یہ سب سے زیادہ بیزار ہیں اور ان لوگوں کو بیوقوف قرار دے رہے ہیں جو اس دعوت کا ساتھ دے رہے ہیں، حماقت اور خرد باختگی کی اس سے بڑھ کر مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔ !

وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا (اور ہم نے دنیا میں اس کو برگزیدہ ٹھہرایا) یہ اس برگزیدگی کی طرف اشارہ ہے جو ان کو دنیا کی قوموں کی سرداری و پیشوائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے بخشی اور جس کا ذکر اوپر آیت ۱۲۴ میں گزر چکا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے سب کی امامت کے لئے منتخب فرمایا احمق ہی ہوگا جو اس کی ملت کی پیروی سے اعراض اختیار کرے گا۔

صالحین کا لفظ قرآن مجید میں عام نیکوکاروں کیلئے بھی استعمال ہوا ہے اور اس پورے زمرے کیلئے بھی استعمال ہوا ہے، جو انبیاء، صدیقین اور شہداء اور صالحین سب پر مشتمل ہے اس آیت میں یہ لفظ اسی وسیع تر معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی

تفسیر تدبر قرآن

(تفسیر آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ)

جس کے مطالعہ سے

- قرآن مجید میں غور و فکر کا شوق پیدا ہوتا ہے۔
- آیت بسم اللہ و سورۂ فاتحہ کی حقیقت و اہمیت واضح ہوتی ہے اور
- قرآن فہمی کی راہیں کھلتی ہیں

قیمت پچھتر پیسے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ میثاق رحمان پورہ۔ اچھرہ لاہور ۱۲

مطالعہ حدیث

مولانا عبدالغفار حسن صاحب

حدیث کے ظنی ہونے کا مفہوم

حدیث کی عظمت واہمیت گھٹانے اور انکار سنت کی راہ ہموار کرنے کے لئے عموماً ان آیات وروایات کا سہارا لیا جاتا ہے جن میں "ظن" کی مذمت اور اس سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ذیل کے مضمون میں "ظن" کی اصل حقیقت قرآن وسنت اور لغت عرب سے واضح کرتے ہوئے یقین وظن کے لحاظ سے سنت وحدیث کا جو مقام ہے اس کو بھی متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(ع - ح)

"ظن" کی مذمت میں مندرجہ ذیل آیات پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ۔ (حجرات ۱۲)

اے ایمان والو! گمان کی بہت سی قسموں سے بچو۔

(۲) إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ۔ (النجم ۲۳)

وہ مشرکین صرف "ظن" اور اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے ہدایت آچکی ہے۔

(۳) إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ (یونس ۶۶)

وہ نہیں پیروی کرتے مگر گمان کی، وہ تو صرف اٹکل سے کام لیتے ہیں۔

(۴) وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا، إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا۔ (یونس ۳۶)

ان میں سے اکثر صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں۔ بلاشبہ ظن حق سے کچھ بھی بے نیاز نہیں کرتا۔

(۵) وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ، إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ (جاثیہ ۲۴)

اور کہا انہوں نے نہیں وہ مگر دنیاوی زندگی۔ ہم مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ، اور ان کو اس کا کچھ بھی علم نہیں، وہ تو صرف ظن وتخمین میں مبتلا ہیں۔

(۶) إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ۔ (جاثیہ ۳۲)

ہم صرف گمان ہی کرتے ہیں اور ہم یقین نہیں رکھتے۔

(۷) وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ۔ (بنی اسرائیل ۳۶)

جس بات کا تمہیں علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑو۔

ان آیات کے علاوہ بخاری ومسلم کی مندرجہ ذیل حدیث کا حوالہ بھی دیا جاتا ہے۔

إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيثِ،

ظن سے بچو، بیشک "ظن" سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

"ظن" کی اصل حقیقت

مذکورہ بالا آیات اور حدیث میں "ظن" کے مفہوم کو متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کو لغت عرب اور قرآن حکیم کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

امام راغب کہتے ہیں۔

الظن اسم لما يحصل عن امارة ومتى قويت ادت الى العلم ومتى ضعفت جدا لم يتجاوز حد التوهم۔

مفردات راغب ص ۳۱۹

علامات وقرائن سے جو شے حاصل ہوا سے ظن کہا جاتا ہے۔ اگر یہ علامات وقرائن قوی ہوتے ہیں تو ظن کی سرحد علم ویقین سے مل جاتی ہے اور اگر یہ قرائن بہت ہی زیادہ کمزور ہوں تو پھر انتہائی درجہ وہم ہے۔

یعنی علامات وقرائن کی قوت وضعف کے لحاظ سے ظن کے درجات ومراتب مختلف ہیں۔

ظن کے مراتب و اقسام

(۱) کسی شئ کے وجود یا عدم پر قرائن و علامات انتہائی قوی اور شکوک و شبہات سے بالاتر ہوں تو ظن کی یہ شکل یقین کے ہم معنیٰ ہے۔ قرآن مجید میں ظن بمعنیٰ یقین متعدد جگہ استعمال ہوا ہے۔

(الف) اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّھِمْ وَ اَنَّھُمْ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ (بقرہ ۴۶)

جو لوگ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

(ب) قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّھُمْ مُّلٰقُوا اللّٰہِ کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ (بقرہ ۲۴۹)

ان لوگوں نے جو اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ملنے والے ہیں کہا کتنے ایسے گروہ تھے جو قلت تعداد کے باوجود کثیر التعداد گروہ پر اللہ کے حکم سے غالب آ گئے۔

ان آیات میں ظن بمعنی یقین یا قریب بہ یقین مراد لینے کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ قرآن مجید نے مومنوں کی ایک نمایاں صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا و بالاخرۃ ہم یوقنون واضح رہے کہ آخرت اور لقاء رب کا مفہوم ایک ہی ہے۔

(۲) ظن کا دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ کسی شئ کے وجود یا عدم پر سو فیصدی قرائن موجود نہ ہوں بلکہ اس سے کم ہوں مثلاً ۶۰ فیصد اور اس سے زیادہ۔ اس کو اردو میں گمانِ غالب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے ظن پر اعتماد و اعتبار نہ صرف یہ کہ پسندیدہ ہے بلکہ بعض حالات میں ضروری اور واجب ہے۔ ظن کا یہ مفہوم ذیل کی آیات میں ملتا ہے۔

(الف) لَوْ لَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْہُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِھِمْ خَیْرًا۔ (نور)

کیوں نہ ایسا ہوا کہ جب تم نے اس (بہتان) کو سنا مومن مردوں اور مومن عورتوں کے بارے میں تم اچھا گمان کرتے۔

اس آیت میں مسلمانوں کو تلقین کی جا رہی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں حسن ظن (خوش گمانی) سے کیوں نہ کام لیا، کیونکہ زیادہ قرائن و علامات اسی بات کے

حق میں تھے کہ حضرت عائشہؓ کا دامن اس قسم کی تہمت سے پاک ہے۔

(ب) فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ۔ (بقرہ ۲۳۰)

دونوں میاں بیوی پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ آپس میں رجوع کر لیں اگر انکو یہ گمان ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کر سکیں گے۔

طلاق رجعی کی شکل میں میاں بیوی سے کہا جا رہا ہے کہ اگر دونوں اپنے حالات اور قرائن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی حدوں کو قائم کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے لئے گمان غالب کی حد تک روشن امکانات موجود ہوں تو میاں بیوی اپنا گھر آباد کر سکتے ہیں۔

(۳) ظن بمعنیٰ شک۔ یعنی کسی چیز کے وجود اور عدم پر یکساں قرائن و علامات موجود ہوں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے قرائن کو ترجیح دینا ناممکن ہو۔ مثلاً ارشاد ربانی ہے۔

وَ اِنَّ الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْہِ لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مَا لَھُمْ بِہٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ مَا قَتَلُوْہُ یَقِیْنًا۔ (نساء)

اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس (عیسیٰ علیہ السلام) کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ اس کی جانب سے شک میں ہیں ان کے پاس اس کے بارے میں کوئی علم و یقین نہیں ہے۔ سوائے ظن کی پیروی کے اور انہوں نے یقیناً قتل نہیں کیا۔

اس آیت میں یہود کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے سلسلے میں ان کے اقوال و آراء کی بنیاد شک پر ہے، علم و یقین پر نہیں ہے۔ اسی شک اور عدم علم و یقین کو اتباع ظن سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس تفصیل سے واضح ہوا کہ اس آیت میں ظن بمعنیٰ شک استعمال ہوا ہے۔

"شک" کے مفہوم کی وضاحت کے لئے ملاحظہ ہو مفردات راغب ص ۲۶۶ الشک اعتدال النقیضین عند الانسان و تساویہما و ذالک قد یکون لوجود امارتین متساویتین عند النقیضین او لعدم الامارۃ منہما۔

(۴) ظن بمعنیٰ وہم یعنی ایسا خیال و گمان جس کی بنیاد کسی دلیل پر نہ ہو بلکہ واضح نص اس کے خلاف موجود ہو۔

مضمون کے شروع میں جن آیات کو نقل کیا گیا ہے ان میں اسی قسم کے بے بنیاد وہم و خیال کی مذمت کی گئی ہے۔ اور حدیث میں اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۵) ظن بمعنیٰ تہمت، جیساکہ ایک قرأت میں ہے۔ وما ہو علی الغیب بظنین۔ سورۂ تکویر بیان ظنین، متہم کے معنیٰ میں ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں ظن کی تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم مذموم اور قابلِ اجتناب ہیں اور اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے ملتی جلتی ہیں۔ مذکورہ بالا زیر بحث آیات پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ آیت نمبر (۱) میں فرمایا گیا ہے کہ گمان کی بہت سی قسموں سے بچو، معلوم ہؤا کہ گمان (ظن) کی ہر شکل قابل مذمت نہیں ہے، اس لئے بعد میں ارشاد ہؤا۔

ان بعض الظن اثم — بلاشبہ گمان کی بعض صورتیں گناہ ہیں۔

آیات (۲۔۳۔۴) میں مشرکین کے عقیدہ شرک اور ان کے مشرکانہ اقوال اور رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہے اور آخر میں ان کے عقائد کی بنیاد ظن و تخمین کو قرار دیا گیا ہے، یعنی ان کے ان عقائد و رسوم کی پشت پر کوئی قابلِ اعتماد دلیل موجود نہیں ہے حالانکہ اس کے برعکس شرک کی تردید اور توحید کے اثبات میں نہایت قوی عقلی اور کائناتی دلائل و قرائن موجود ہیں۔

آیت (۵) میں حشر و نشر کے انکار کو "ظن" یعنی بے بنیاد وہم قرار دیا گیا ہے کیونکہ حشر و نشر (زندگی بعد موت) کا ثبوت متعدد عقلی اور نقلی دلائل و براہین سے واضح ہو چکا ہے۔ اس کا انکار کسی یقین اور علمی استدلال پر مبنی نہیں ہے۔

آیت (۶) میں مشرکین کا مقولہ نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے قیامت کا انکار کرتے ہوئے کہا تھا، آیت (۷) میں ان باتوں کے پیچھے پڑنے اور ان کے بارے میں زبان کھولنے سے منع کیا گیا ہے۔ جن کی بنیاد وہم و خیال پر ہو اس لحاظ سے یہ آیت، آیت نمبر ۱ کے ہم معنیٰ ہے۔ اسی طرح حدیث "وایاکم والظن" میں اس "ظن" سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو شکی اور وہمی مزاج کی پیداوار ہو۔

"ظن" کے یہ مراتب و اقسام اسی طرح ہیں، جس طرح کہ "یقین" کے متعدد مراتب و اقسام قرآن مجید سے معلوم ہوتے ہیں۔

مراتب یقین

قرآن مجید میں یقین کے تین مراتب و منازل بیان کئے گئے ہیں۔ علم الیقین عین الیقین اور حق الیقین۔

امام ابن تیمیہؒ نے ان تینوں مراتب کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "علم الیقین" علم کے اس درجہ کا نام ہے جو کسی شخص کو کسی کی بات سننے، کسی دوسرے شخص کے بتلانے اور کسی امر میں قیاس اور غور و فکر کرنے سے حاصل ہو، پھر جب اسے آنکھوں سے مشاہدہ اور معائنہ کرے گا تو اسے عین الیقین کا مرتبہ حاصل ہو جائیگا اور جب دیکھنے کے بعد اسے چھوئیگا، محسوس کریگا، اُسے چکھیگا اور اس کی حقیقت کو پہچان لے گا تو اسے حق الیقین کا مقام حاصل ہو جائے گا۔ علم الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے خبر دی کہ فلاں مقام پر شہد ہے اب راوی پر اعتماد کرتے ہوئے اس کی تصدیق کرنا علم الیقین ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ خود آنکھوں سے شہد کے چھتے کا مشاہدہ کر لیا جائے یہ عین الیقین کا مرتبہ ہے یہ درجہ پہلے مرتبہ کی بہ نسبت اعلیٰ اور یقین و اذعان کے لحاظ سے اونچا مقام رکھتا ہے، جیساکہ حدیث میں ہے۔ لیس المخبر کالمعاین، یعنی جو کان سے سن لے وہ اس کے برابر نہیں ہو سکتا جو آنکھ سے دیکھ لے، حق الیقین کی مثال یہ ہے کہ کسی نے شہد کو چکھ کر اس کا مزہ اور اس کی مٹھاس محسوس کر لی۔ یہ تیسرا درجہ دوسرے درجہ کی نسبت ارفع و اعلیٰ ہے۔

اب یوں سمجھنا چاہیئے کہ جہاں سے یقین کا ابتدائی درجہ شروع ہوتا ہے وہاں ظن کی اعلیٰ ترین قسم کی سرحد ختم ہوتی ہے۔ یقین کے یہ تینوں مراتب درجہ بدرجہ شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہیں۔ لیکن ظن کی مذکورہ بالا پانچ اقسام میں سے دو یعنی ظن بمعنیٰ یقین اور ظن بمعنیٰ گمان غالب مستحسن ہیں بلکہ بعض حالات میں ان پر اعتماد کرنا واجب ہے۔ باقی رہیں آخری تین قسمیں تو ان سے احتراز و اجتناب ضروری ہے۔ اصول حدیث کی کتابوں میں حدیث کو ظنی یا مفید کہا گیا ہے۔ اس سے مراد ظن کے پہلے یا دوسرے معنیٰ ہو سکتے ہیں نہ کہ تیسرے اور چوتھے معنیٰ۔

واضح رہے کہ گمان غالب کے لحاظ سے مفید ظن روایات کو اخبار آحاد کہا جاتا ہے یعنی ایسی حدیث جن کے راوی تعداد کے اعتبار سے حد تواتر کو نہ پہنچے ہوں۔

خبر متواتر اس حدیث کو کہتے ہیں جس کے راوی ہر دور میں اتنے زیادہ رہے ہوں کہ عادۃً ان کا جھوٹ پر متفق ہو جانا ناممکن ہو۔

اب یقین کے مختلف مراتب اور ظن کی متعدد صورتوں کے اعتبار سے حدیث کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

(۱) ایسے عملی مسائل پر مشتمل احادیث جو امت میں شروع سے اب تک بغیر کسی اختلاف کے ایک دور سے دوسرے دور میں منتقل ہوتی رہی ہیں۔ مثلاً اذان و اقامت کے کلمات، صبح کی دو رکعتیں، مغرب کی تین رکعتیں، اور عصر کی چار رکعتیں، رکوع و سجود کی تعداد، اس قسم کے بیسیوں وہ امور ہیں جو حدیث کی مستند کتابوں میں درج ہیں اور ان کی تائید میں پوری امت کا تعامل (عمل در آمد) بغیر کسی شائبہ اختلاف کے موجود ہے۔ سنت و حدیث کا یہ وہ سرمایہ ہے جس کا یقینی پہلو قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کی طرح محکم اور مضبوط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے کاتبوں اور حافظوں کی تعداد اگر ہر دور میں لاکھوں رہی ہوگی، تو نمازیوں اور روزہ رکھنے والوں کی گنتی کروڑوں سے کم نہ ہوگی۔ تواتر اور راویوں کی ان گنت تعداد کے لحاظ سے حدیث کا یہ سرمایہ قرآن ہی کی طرح یقینی ہے۔ اس کا انکار خود قرآن کے انکار کے ہم معنیٰ ہے۔

حدیث کا یہ سرمایہ شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے اعتبار سے حق الیقین کا مقام رکھتا ہے۔

(۲) تواتر کی دوسری قسم علم کی اصطلاح میں تواتر طبقہ عن الطبقہ کہلاتی ہے۔ یعنی ایک دور کے ان گنت افراد دوسرے اور بے شمار لوگوں کی طرف کامل اتفاق کے ساتھ کسی بات کو منتقل کرتے ہیں۔ اس کی واضح مثال قرآن مجید کا ایک دور سے دوسرے دور کی طرف تواتر کے ساتھ منتقل ہونا ہے یہ قسم بھی حق الیقین کے درجہ میں ہے۔

(۳) تواتر اسناد۔ یعنی حدیث کا ایک متن متعدد سندوں سے مروی ہو یہ تعداد بھی اتنی ہو کہ حدِ تواتر تک پہنچ جائے۔ مثلاً حدیث من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعدہ من النار (یعنی جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنائے)۔

یہ روایت ۶۲ صحابہ سے منقول ہے جن میں عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔ ایک دوسری تحقیق کے مطابق صحابہ کی تعداد سو سے بھی متجاوز ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ ابن اصلاح صـ۱۳۵

اسی طرح ختم نبوت پر احادیث ۱۵۰ صحابہ سے مروی ہیں جن میں سے تیس ۳۰ صحابہ کے اسمائے گرامی صحاح ستہ میں ملتے ہیں۔ مقدمہ فتح الملہم شرح مسلم صـ۶

(۴) تواتر قدر مشترک یا تواتر معنوی۔ یعنی کسی واقعہ کے بارے میں منقول تمام جزئیات و تفصیلات تو حدِ تواتر کو نہیں پہونچتیں، لیکن مختلف روایات میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے اس کے متواتر ہونے سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا، مثلاً حاتم طائی کی سخاوت کے بارے میں جو تفصیلات زبان زد عوام ہیں وہ سب کی سب متواتر نہیں ہیں، لیکن ان سب حکایات و واقعات میں ایک بات قدر مشترک کی حیثیت سے پائی جاتی ہے اور وہ ہے حاتم کی بے پناہ جود و سخا۔ اس کا انکار بداہت کے انکار کا ہم معنیٰ ہے سنت کے مستند ذخیرے میں اس تواتر کی نمایاں مثال احادیث معجزات ہیں۔ یہ روایات اپنی سند اور راویوں کی تعداد کے لحاظ سے متواتر کی حد سے کم ہیں لیکن ان میں جو قدر مشترک پایا جاتا ہے اس کے متواتر ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان احادیث میں یہ بات قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض ایسے افعال کا صدور ہوا ہے جو خارق عادت اور سلسلہ اسباب سے ماوراء ہیں۔

حدیث کی اقسام (۳، ۴) سے یقین و اطمینان کی وہی کیفیت حاصل ہوتی ہے جو "عین الیقین" سے حاصل ہو سکتی ہے۔

حدیث متواتر کی ان اقسام کے بعد خبر واحد کا نمبر آتا ہے۔ راویوں کی تعداد اور ان کی ثقاہت کے لحاظ سے اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں ان میں سے بعض اقسام مفید یقین ہیں (یعنی ان سے علم الیقین کی سی اطمینانی کیفیت حاصل ہوتی ہے) اور بعض انواع مفید ظن ہیں یعنی گمان غالب کی حد تک انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ (باقی)

افادات فراہی

از جناب خالد مسعود صاحب

اصولِ تفسیر

اس مضمون کی دو قسطیں جو پہلے شائع ہوئی ہیں نظم کلام کے نظری پہلو واضح کرتی ہیں۔ اس قسط میں عملی پہلو پیش کیا گیا ہے اس لئے ان لوگوں کے لئے اس مضمون کا مدعا سمجھنا مشکل ہوگا جنہوں نے قرآن کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور جو نظم کی مشکلات سے واقف نہیں (ادارہ)

نظام اور مناسبت میں فرق

بعض علماء نے آیات اور سورتوں کی باہمی مناسبت کے باب میں کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔ لیکن نظم قرآن کے باب خاص میں کسی تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔ میرے نزدیک نظام اور مناسبت دونوں میں فرق ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ مناسبت نظام کا محض ایک حصہ ہوتی ہے کیونکہ آیات کی باہمی مناسبت کلام کے بارے میں کوئی مستقل بالذات چیز واضح نہیں کرتی۔ ایک ایسا شخص جو محض مناسبت کا متلاشی ہو وہ آیات کی کسی ایسی مناسبت پر بھی قناعت کر سکتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اول تا آخر پورے کلام کو منظم کرنے والی مناسبت سے غافل ہو جائے۔ ایسا شخص پاس پاس کی ان دو آیتوں میں بھی نسبت تلاش کرنے لگے گا جن کا آپس میں کوئی تعلق نہ ہو بلکہ ان میں سے ایک آیت کسی سابقہ سلسلہ بیان سے متعلق ہو۔ قرآن مجید میں اس طرح کے مواقع بے شمار ہیں۔ ان مواقع پر بڑے ذہین لوگوں کو بھی آیات کی نسبتیں معلوم کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔

نظم سے ہماری مراد سورہ کے اجزا کی وہ باہمی نسبت ہے جس کے نتیجہ میں پوری سورہ ایک وحدت میں ڈھل جائے۔ اس کا تعلق ان سورتوں کے ساتھ معلوم ہو جائے جو اس کے ساتھ ملحق ہیں یا اس سے پہلے یا بعد میں کچھ فاصلے پر واقع ہیں (کیونکہ عین ممکن ہے کہ جس طرح بعض

آیات جملہ معترضہ کی حیثیت سے آجاتی ہیں اسی طرح بعض سورتیں بھی معترضہ سورتیں بن کر آئی ہوں) نظم معلوم ہو جانے کے بعد اول سے آخر تک پورا قرآن مناسبت و ترتیب رکھنے والا کلام معلوم ہوگا۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ نظام محض مناسبت یا محض ترتیب اجزا سے ایک زائد چیز ہے۔

وحدانیت

ہر منظم کلام کا ایک مرکزی مضمون ہوتا ہے۔ جس کی طرف پورا کلام لوٹتا ہے۔ اس لئے نظام وہی قابل قبول ہو سکتا ہے جو پوری سورہ کو ایک وحدت عطا کرے اور اس کے تمام اجزاء ایک خاص مرکزی مضمون سے مربوط ہو جائیں۔

وحدانیت، مناسبت اور ترتیب کے پہلو سے کلام کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ایک کلام وحدانیت رکھتے ہوئے بھی تناسب و ترتیب سے خالی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک کتاب پند و نصائح کی جامع ہے اس میں دین و اخلاق اور معاشرت و سیاست کے متعلق متعدد اقوال بغیر کسی ترتیب کے جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ کتاب گو وحدانیت سے خالی نہیں ہوگی (اس کی وحدانیت کمزور سہی) کیونکہ یہ تمام تر پند و نصائح کے باب میں ہے لیکن اس کے باوجود اسمیں تناسب و ترتیب کا فقدان ہوگا۔ اب اس کتاب کے اقوال کو دین و اخلاق وغیرہ کے الگ الگ ابواب میں تقسیم کرکے کتاب تصنیف کر دو تو گو اس کتاب میں تناسب ہوگا لیکن وحدانیت حسب سابق کمزور رہے گی۔ انہی نصائح کو کلیلہ و دمنہ کے نہج پر ایک جامع قصہ کی شکل میں جمع کر دو تو مجموعی طور پر اگرچہ یہ تصنیف کمزور وحدت رکھتی ہوگی لیکن الگ الگ اس کے ہر باب میں وحدت پائی جائے گی۔ پند و نصائح کے اسی مواد کو جب حسن ترتیب اور مناسبت کے ساتھ ابواب میں تقسیم کروگے اور کلام کو اس طرح مرتب کروگے کہ یہ تمام کا تمام ایک خاص موضوع سے متعلق ہو جائے اور اس کے تمام اجزا میں باہمی مناسبت پیدا ہو جائے تو اب یہ کتاب کامل نظام رکھنے والی ہوگی۔ گویا کلام کے حسن ترتیب اور حسن تناسب کے ساتھ ساتھ ایک مضبوط وحدانیت بھی حسن نظام کی ایک ضروری شرط ہے۔

عمود کی خصوصیات اور اس کی تعیین

نظام اور وحدانیت رکھنے والے ہر کلام کا ایک عمود ہوتا ہے۔ یہ پورے خطاب کے تمام مطالب کا جامع اور کلام کا مقصود و مطلوب اور حاصل ہوتا ہے۔ عمود، کلام کی ترتیب کا کوئی جزو نہیں ہوتا

بلکہ یہ اس میں شرح کی طرح جاری و ساری ہوتا ہے۔ یہ ایک منطقی نتیجہ اور مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کی شرح و تفصیل اور دلیل کلام کی ایک ایک سطر پیش کرتی ہے۔ عمود کا اختفاء بسا اوقات اچھا ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معلوم کرنے کے لئے کلام پر گہرے فکر و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے ٹھیک ٹھیک واقف ہونے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ آدمی نظم کلام میں غور کرے، جملوں کے درو بست کو پہچانے اور کلام کے مطالب کا اچھی طرح احاطہ کرے۔ اس غور فکر کے بعد جو عمود سمجھ میں آئے، اس کی روشنی میں دیکھے کہ مزید تفصیل میں جانے کے بعد بھی حسن نظام ثابت ہوتا ہے یا نہیں۔ اگر نظام کے ساتھ یہ مفروضہ عمود ٹھیک بیٹھ جائے تو اسے اختیار کرے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے ترک کر کے دوسرا عمود تلاش کرے۔

عمود کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سورہ کے اندر اپنی حقیقت کے اعتبار سے سب سے عظیم الشان بات ہو۔ اہل نظر سے یہ بات مخفی نہیں کہ ایک سورہ کی تمام آیتیں یکساں اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ ان میں سے بعض آیتیں اپنے گرد و پیش کی آیات سے بہت زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ایسی آیات پر خاص طور پر غور کرنا چاہیئے، ان کے محاسن و مطالب کی وضاحت کرنی چاہیئے اور نظائر سے ان کی دلالت کو واضح کرنا چاہیئے تاکہ لوگ ان پر اندھے بہرے ہو کر نہ گریں۔ عمود سے ہماری مراد اس طرح کی عظیم الشان آیتیں نہیں ہیں۔ عمود کے لئے عظیم الشان بات نہیں بلکہ سب سے زیادہ جامع بات ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ سورہ کے تمام مطالب کے لئے شیرازہ کا کام دیتا ہے۔ ہاں بیان کے لحاظ سے وہ سورہ کے اندر سب سے اہم چیز ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر سورہ نور کے اندر آیت اللّٰہ نور السمٰوٰتِ والارض..... کو دیکھئے۔ یہ کس طرح آفتاب تاباں بن کر چمک رہی ہے لیکن اس کے باوجود وہ سورہ کے اندر عمود کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ایک بالکل ضمنی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ عمود اس کا عورتوں سے متعلق حسنِ ادب کی تعلیم ہے۔ اسی وجہ سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ یہ سورہ عورتوں کو پڑھائی جائے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کو معلوم کر سکیں۔

سورتوں کی اس طرح کی عظیم الشان آیات لغت، اعراب، بلاغت، تاریخ، فقہ، حکمت وغیرہ مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک ٹیلے پر جلتی ہوئی آگ کی طرف آدمی

متوجہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ان آیات کی طرف عمود کا ہر متلاشی پہلی ہی نظر میں متوجہ ہو جاتا ہے۔ لیکن جب نظم کلام معلوم کرنے کی غرض سے آدمی آیات میں تدبر کرتا ہے اور سیاق و سباق کی دلالتوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اس وقت ان نمایاں آیات کے بجائے بعض دوسری آیات ابھر آتی ہیں جو دوسرے پہلو سے عظیم الشان ہوتی ہیں۔

عمود ہر سورہ کا ایک ہی ہوتا ہے لیکن یہی ایک بسا اوقات بہت سی چیزوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ مثلاً سورہ حجرات کے عمود کو لو۔ ہے یہ ایک ہی بات۔ گو لغت میں ہم اس کے لئے ایک ہی جامع لفظ نہ پا سکیں۔ تعبیر مطلب کے لئے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سورہ میں بد خلقی پر ملامت اور جھڑکی ہے، عام اس سے کہ وہ بد خلقی خیال سے تعلق رکھتی ہے یا قول سے یا عمل سے۔ چنانچہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گفتگو میں سبقت، آپ کی آواز پر آواز بلند کرنے، عام آدمیوں کی طرح آپ کو پکارنے، بے ضرورت اور بے موقع آپ کو زحمت دینے اور کسی فاسق کی اطلاع پر کسی قوم پر ٹوٹ پڑنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پھر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں اصلاح، ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت اور ان کے درمیان عدل کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد لوگوں کے ساتھ تمسخر سے ان کی عیب جوئی سے، تنابز بالالقاب سے، بدگمانی سے، تجسس سے، غیبت سے، غرور سے، ادعائے پارسائی سے اور پھر سب سے آخر میں سب سے بدترین شے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اسلام کا احسان دھرنے سے روکا گیا ہے۔

عمود کی تلاش مشکل کیوں ہے؟

سورہ کے عمود کی تعیین اگرچہ اس کے نظام کی معرفت کی کنجی ہے، لیکن ہے یہ انتہائی مشکل کام، اس کے لئے بڑے تدبر، چھان پھٹک اور آگے پیچھے کی ہم مضمون سورتوں پر اس وقت تک غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے جب تک کہ عمود آفتاب کی مانند چمکنے نہ لگے، اس سے سورہ کا ایک ایک گوشہ روشن نہ ہو جائے اور ہر آیت کا موقع و محل اور اس کی راجح تاویل متعین نہ ہو جائے۔ عمود کی تلاش کا یہ کام بوجوہ مشکل ہے، ان میں سے چند اہم وجوہات کا ہم یہاں ذکر کریں گے۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید متشابہ و مثانی نازل ہوا ہے۔ اس میں کئی سورتیں مشابہ مطالب کی حامل ہوتے ہوئے مختلف عمود رکھتی ہیں یا اس کے برعکس ان کے مضامین غیر مشابہ ہیں لیکن

عمود ایک ہی ہے۔ جب تک آدمی ان سورتوں کے مضامین میں غور کر کے راجح عمود نکال نہیں لیتا اس وقت تک اس کی حالت اس مسافر کی ہوتی ہے جو چوراہے میں کھڑا ہو اور جس راستہ پر بھی جائے اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا نے قرآن کو جس طرح عقائد و شرائع کے واجبات کی تعلیم کے لئے نازل فرمایا اسی طرح اس کا ایک مقصد تعلیم حکمت بھی رکھا ہے۔ یہ تعلیم حکمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے تھی۔ اسی لئے آپ کو خیر المعلمین بنایا اور وہ آیات عطا فرمائیں جو کمال تعلیم ہیں۔ تعلیم حکمت کا یہ اصول ہے کہ یہ معارف کے القاء سے نہیں بلکہ فکر و عقل کے اس حد تک استعمال سے حاصل ہوتی ہے جس سے آدمی کی پوشیدہ قوتیں ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ جس طرح ہر تربیت کا اصول ہے قرآن کو ایک پہلو سے ظاہر و واضح بنایا لیکن دوسرے پہلو سے اسے باطن اور سربستہ راز رکھا تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمت و کوشش کے مطابق اس کے باطن کے مدارج پر ترقی کرتے جائیں۔ قرآن مجید کا نظام غور و فکر کا محل ہے اور عمود بالکل مخفی۔ اگر سورتوں کے عمود واضح کر دیے جاتے تو نظام سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی، لیکن اس طرح قرآن تعلیم حکمت کی غرض کو پورا نہ کرتا۔ عقلوں کی آزمائش ہی کی خاطر اللہ تعالےٰ نے عمود کو ثریا کی بلندی پر رکھ چھوڑا ہے۔

تیسری وجہ عمود کے مشکل ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے مندرجہ بالا مقصد ہی سے قرآن مجید کو غایت درجہ مختصر بنایا لیکن اسے حکمتوں سے معمور کر دیا۔ اس کے عالی مضامین اور گراں قدر مطالب کی بنا پر ایک قاری متحیر ہو جاتا ہے۔ یکساں اہمیت کی چیزوں میں سے اس کے لئے ایک عمود کا انتخاب اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے جس طرح بہت سارے عمدہ جواہر کی موجودگی میں یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دے کر اسے ہار کے وسط میں جگہ دی جائے۔

نظام کا تعلق تاریخ سے

مختلف واقعات کے نظم کے جو متعدد پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک پہلو زمانے کا قرب بھی ہے۔ مثلاً دعوت کے ابتدائی زمانے کے واقعات اسی پہلو سے منظم ہیں اور ایک دوسرے سے ہٹ کر نہیں

آتے۔ اسی طرح ہجرت کے موقع یا اس کے بعد کے واقعات میں، پھر مدینہ کی ریاست یا فتح مکہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے مسائل ہیں۔ یہ سب معلوم و مشہور اور نمایاں ہیں۔ اسی زمانی بنیاد پر علمائے سلف نے مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے یا بعض کی آیات کو مدنی یا مدنی آیات کو مکی کہا ہے۔ انہوں نے اس سے زیادہ تقسیم نہیں کی۔ اگر انہی کے اصول پر مزید غور کیا جائے تو ابتدائی دعوت، قبیل ہجرت یا فتح مکہ کے زمانہ کی آیات بھی پوشیدہ نہیں رہتیں۔ البتہ ایک زیادہ مخفی پہلو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور وہ مستقبل سے متعلق آیات کا نظم ہے۔ قرآن میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ اس امت کو مستقبل میں کیا حالات درپیش ہوں گے اور انہیں کس چیز کی حاجت ہوگی۔ صحابہ ان اشارات سے واقف تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان اشارات کے مصداق بتایا کرتے تھے۔

موقع کلام اور نظام

ایک اور چیز جو فہم نظام میں مدد دیتی ہے، موقع کلام کا تعین ہے۔ موقع کلام میں ظاہر یا مخفی اس کی دلالت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کا نظم اس کے موقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور اس موقعہ کی دلالت سے آدمی اس وقت واقف ہوتا ہے جب تسبیح کے مواقع جان لے۔ تسبیح کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو اس موقع پر دیا جاتا جب آپ اپنی تعلیم کا اثر دیکھتے اور صحابہ کے اندر مطلوبہ صفات کا مشاہدہ فرماتے۔ اس موقع پر آپ کے لئے شکر و حمد واجب تھا۔ لہذا آپؐ کو تسبیح کا حکم ہوتا۔ مثلاً سورہ نصر میں یا مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ	اور خدائے غالب و دانا پر توکل کر جو تم کو دیکھتا
الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَ	ہے جب تم اٹھتے ہو اور نمازیوں میں تمہارے
تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (الشعراء ۲۱۷-۲۱۹)	پھرنے کو بھی دیکھتا ہے۔

اسی بنا پر حضورؐ کو اس وقت بھی تسبیح کا حکم دیا جاتا جب آپؐ صحابہ کو نماز پڑھتے، انفاق کرتے اور آپؐ کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے دیکھتے، جیسا کہ صحابہ کی یہ صفت بیان ہوئی کہ۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ	ایک کھیتی کی مانند جس نے اپنی کونپل نکالی

عمود ایک ہی ہے۔ جب تک آدمی ان سورتوں کے مضامین میں غور کر کے راجح عمود نکال نہیں لیتا اس وقت تک اس کی حالت اس مسافر کی ہوتی ہے جو چوراہے میں کھڑا ہو اور جس راستہ پر بھی جائے اپنی منزل سے دور ہوتا چلا جائے۔

دوسری وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا نے قرآن کو جس طرح عقائد و شرائع کے واجبات کی تعلیم کے لئے نازل فرمایا اسی طرح اس کا ایک مقصد تعلیم حکمت بھی رکھا ہے۔ یہ تعلیم حکمت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں سے تھی، اسی لئے آپ کو خیر المعلمین بنایا اور وہ آیات عطا فرمائیں جو کمال تعلیم ہیں۔ تعلیم حکمت کا یہ اصول ہے کہ یہ معارف کے القاء سے نہیں بلکہ فکر و عقل کے اس حد تک استعمال سے حاصل ہوتی ہے جس سے آدمی کی پوشیدہ قوتیں ظاہر ہو جائیں۔ چنانچہ جس طرح ہر تربیت کا اصول ہے قرآن کو ایک پہلو سے ظاہر و واضح بنایا لیکن دوسرے پہلو سے اسے باطن اور سربستہ راز رکھا تاکہ لوگ اپنی اپنی ہمت و کوشش کے مطابق اس کے باطن کے مدارج پر ترقی کرتے جائیں۔ قرآن مجید کا نظام غور و فکر کا محل ہے اور عمود بالکل مخفی۔ اگر سورتوں کے عمود واضح کر دیے جاتے تو نظام سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی، لیکن اس طرح قرآن تعلیم حکمت کی غرض کو پورا نہ کرتا۔ عقلوں کی آزمائش ہی کی خاطر اللہ تعالیٰ نے عمود کو ثریا کی بلندی پر رکھ چھوڑا ہے۔

تیسری وجہ عمود کے مشکل ہونے کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا مقصد ہی سے قرآن مجید کو غایت درجہ مختصر بنایا لیکن اسے حکمتوں سے معمور کر دیا۔ اس کے عالی مضامین اور گراں قدر مطالب کی بنا پر ایک قاری متحیر ہو جاتا ہے۔ یکساں اہمیت کی چیزوں میں سے اس کے لئے ایک عمود کا انتخاب اسی طرح مشکل ہو جاتا ہے جس طرح بہت سارے عمدہ جواہر کی موجودگی میں یہ فیصلہ مشکل ہوتا ہے کہ ان میں سے کس کو ترجیح دے کر اسے ہار کے وسط میں جگہ دی جائے۔

نظام کا تعلق تاریخ سے

مختلف واقعات کے نظم کے جو متعدد پہلو ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک پہلو زمانے کا قرب بھی ہے۔ مثلاً دعوت کے ابتدائی زمانے کے واقعات اسی پہلو سے منظم ہیں اور ایک دوسرے سے بٹ کر نہیں

آئے۔ اسی طرح ہجرت کے موقع یا اس کے بعد کے واقعات ہیں، پھر مدینہ کی ریاست یا فتح مکہ اور اس کے بعد کے زمانہ کے مسائل ہیں۔ یہ سب معلوم و مشہور اور نمایاں ہیں۔ اسی زمانی بنیاد پر علمائے سلف نے مکی و مدنی سورتوں کی تقسیم کی ہے یا بعض کی آیات کو مدنی یا مدنی آیات کو مکی کہا ہے۔ انہوں نے اس سے زیادہ تقسیم نہیں کی۔ اگر انہی کے اصول پر مزید غور کیا جائے تو ابتدائی دعوت، قبیل ہجرت یا فتح مکہ کے زمانہ کی آیات بھی پوشیدہ نہیں رہتیں۔ البتہ ایک زیادہ مخفی پہلو پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور وہ مستقبل سے متعلق آیات کا نظم ہے۔ قرآن میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ اس امت کو مستقبل میں کیا حالات درپیش ہوں گے اور انہیں کس چیز کی حاجت ہوگی۔ صحابہ ان اشارات سے واقف تھے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان اشارات کے مصداق بتایا کرتے تھے۔

موقع کلام اور نظام

ایک اور چیز جو فہم نظام میں مدد دیتی ہے، موقع کلام کا تعین ہے۔ موقع کلام میں ظاہر یا مخفی اس کی دلالت موجود ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ اعلیٰ کی آیت سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰى کا نظم اس کے موقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور اس موقعہ کی دلالت سے آدمی اس وقت واقف ہوتا ہے جب تسبیح کے مواقع جان لے۔ تسبیح کا حکم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تو اس موقع پر دیا جاتا جب آپ اپنی تعلیم کا اثر دیکھتے اور صحابہ کے اندر مطلوبہ صفات کا مشاہدہ فرماتے۔ اس موقع پر آپ کے لئے شکر و حمد واجب تھا۔ لہٰذا آپ کو تسبیح کا حکم ہوتا۔ مثلاً سورہ نصر میں یا مندرجہ ذیل آیت میں ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ	اور خدائے غالب و دانا پر توکل کر جو تم کو دیکھتا
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ وَ	ہے جب تم اٹھتے ہو اور نمازیوں میں تمہارے
تَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ (الشعراء ۲۱۷-۲۱۹)	پھرنے کو بھی دیکھتا ہے۔

اسی بنا پر حضورؐ کو اس وقت بھی تسبیح کا حکم دیا جاتا جب آپؐ صحابہ کو نماز پڑھتے، انفاق کرتے اور آپؐ کی نصیحت سے فائدہ اٹھاتے دیکھتے، جیسا کہ صحابہ کی یہ صفت بیان ہوئی کہ۔

كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ	ایک کھیتی کی مانند جس نے اپنی کونپل نکالی

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح ۲۹) — پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی۔ اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے۔

تسبیح نماز کے حکم کا دوسرا موقع وہ تھا جب جھٹلانے والوں کی مخالفت کے نتیجہ میں آپ کو ملال ہوتا۔ یہ موقع صبر و ثبات، تسلی، استراحت اور اپنے ساتھیوں کی طرف رجوع کرنے کا ہوتا۔ متعدد سورتوں میں اس موقع کی آیات آئی ہیں۔ سورہ اعلیٰ کے نزول کے زمانہ میں یہ دونوں حالتیں جمع ہو گئیں۔ چنانچہ یہاں تم دونوں گروہوں ــــ موافقین و مخالفین ــــ کا ذکر پاؤ گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر اس بات کا غلبہ تھا کہ مکذبین کو چھوڑ کر تلاوت قرآن اور نماز کو اختیار کریں۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے شکر کی تسبیح کرنے خدا سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نصیحت کے کام کو جاری رکھنے کا بھی حکم دیا۔ فرمایا کہ وہی ہادی اور کارساز ہے جو تمہاری دعوت کو مفید بنائے گا اور تمہارا کام آسان کرے گا۔ وہی ہے جو مخلوق کو اس کی تقدیر کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض لوگ تمہاری دعوت سے نصیحت حاصل کریں گے، دوسرے اس سے پہلو تہی کریں گے۔ تم خدا کے شکر گزار ہو کر کام کئے جاؤ اور مخالفوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاؤ۔ فرمایا:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى — پس یاد دہانی کرو اگر یاددہانی فائدہ کرے۔

یعنی نہ ان کے پیچھے پڑو اور نہ انہیں بالکل ترک کرو کیونکہ یہ اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایت یا محرومی اور فلاح یا بدبختی کی راہ اختیار کریں گے۔

فہم نظام میں تمہید کا لحاظ جس طرح نحوی اعتبار سے ایک جملہ کے اجزائے ترکیبی، مبتدا و خبر، فعل و فاعل اور مفعول و حال وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح ایک کلام کے بھی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ اجمالی طور پر یہ چار اجزاء ہوتے ہیں ــــ عمود، تمہید، نفس مضمون اور خاتمہ۔

جہاں تک تمہید کا تعلق ہے، کلام کے شروع میں اسے لانے کی ضرورت، عموماً اس وقت ہوتی ہے۔ جب اس بات کا امکان ہو کہ مخاطب پر وہ بات مشکل ہو گی۔ لہٰذا اصل مقصود

کے لئے اس کو تیار کرنے کی خاطر تمہیدی بیان پہلے لایا جاتا ہے۔ اگرچہ تمہید کی بنیادی ضرورت یہی ہے۔ لیکن کلام میں اس کے بے شمار دوسرے پہلو بھی ہیں۔ اس کی مقدار بھی مختلف ہو سکتی ہے اور اس سے فائدے بھی ان گنت حاصل کئے جاتے ہیں۔

تمہید کو اتنا طویل کرنا کہ وہ مقصود کلام کے بیشتر حصہ پر چھا جائے، پسندیدہ نہیں۔ لیکن ایک ماہر متکلم کلام کے مختلف طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ بات کو اس طریقہ سے پھیر لے جائیگا جس کا مخاطبین کو سان گمان بھی نہ ہو گا۔ کبھی وہ تمہید کو طویل کر کے یا تو اپنا مقصود موزوں عبارت میں کہہ دے گا یا اسی تمہید کو اصل بات کہنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور کبھی وہ تمہید سے اصل مضمون کی طرف بتدریج آئے گا لیکن کلام کی تفصیل نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر مخاطب مطیع و منقاد ہے تو وہ تمہید کو ترک ہی کر دے یا اگر قہر و غضب کی حالت میں کوئی حکم دے تو مخاطب پر بجلی کی سی کڑک کے ساتھ ٹوٹ پڑے ان مواقع کی مثالیں تم سورۂ نور یا سورہ توبہ میں دیکھو گے یا پھر ان مواقع پر دیکھو گے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب کیا گیا ہے۔

کوائف مدارس عربیہ مغربی پاکستان

دینی مدارس کی تاریخ اور جائزہ

مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تاریخ، جائزہ اور اعداد و شمار ساڑھے آٹھ صد صفحات پر مشتمل کتاب پہلی بار دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ ملک اور بیرون ملک میں بندہ کی اس خدمت کو سراہا گیا۔ اس وقت دو صد کے قریب مدارس کے کوائف مہیا ہو سکے تھے۔ دو سال کے دوران نئے مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں کچھ قدیم مدارس نے بھی ترقی کے کئی مراحل طے کر لیے ہیں ــــ ان حالات میں ضروری ہو گیا کہ تمام قدیم و جدید مدارس کی تاریخ از سر نو مرتب کروں۔

جن مدارس کے پتے معلوم ہو سکے اس مقصد کے لئے انہیں تیرہ صد کے قریب سوالنامے روانہ کر چکا ہوں جنہیں نہ ملے ہوں اس پتے سے بلاقیمت طلب فرمائیں۔

حافظ نذر احمد۔ سندر منزل۔ ۱۰۴۔ محمد نگر۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ (فتح ۲۹)

پھر اس کو مضبوط کیا، پھر موٹی ہوئی۔ اور پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی اور لگی کھیتی والوں کو خوش کرنے۔

تسبیح و نماز کے حکم کا دوسرا موقع وہ تھا جب جھٹلانے والوں کی مخالفت کے نتیجہ میں آپ کو ملال ہوتا۔ یہ موقع صبر و ثبات، تسلی، استراحت اور اپنے ساتھیوں کی طرف رجوع کرنے کا ہوتا۔ متعدد سورتوں میں اس موقع کی آیات آتی ہیں۔ سورہ اعلیٰ کے نزول کے زمانہ میں یہ دونوں حالتیں جمع ہو گئیں۔ چنانچہ یہاں تم دونوں گروہوں —— موافقین و مخالفین —— کا ذکر پاؤ گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر اس بات کا غلبہ تھا کہ مکذبین کو چھوڑ کر تلاوت قرآن اور نماز کو اختیار کریں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے شکر کی تسبیح کرنے خدا سے مدد طلب کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کی نصیحت کے کام کو جاری رکھنے کا بھی حکم دیا۔ فرمایا کہ وہی ہادی اور کارساز ہے جو تمہاری دعوت کو مفید بنائے گا اور تمہارا کام آسان کرے گا۔ وہی ہے جو مخلوق کو اس کی تقدیر کی طرف لے جاتا ہے۔ بعض لوگ تمہاری دعوت سے نصیحت حاصل کریں گے، دوسرے اس سے پہلوتہی کریں گے۔ تم خدا کے شکر گزار ہو کر کام کئے جاؤ اور مخالفوں کی مخالفت کو خاطر میں نہ لاؤ۔ فرمایا:

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى — پس یاد دہانی کرو اگر یاد دہانی فائدہ کرے۔

یعنی نہ ان کے پیچھے پڑو اور نہ انہیں بالکل ترک کرو کیونکہ یہ اپنے اپنے حالات کے مطابق ہدایت یا محرومی اور فلاح یا بدبختی کی راہ اختیار کریں گے۔

فہم نظام میں تمہید کا لحاظ جس طرح نحوی اعتبار سے ایک جملہ کے اجزائے ترکیبی، مبتدا و خبر، فعل و فاعل اور مفعول و حال وغیرہ ہوتے ہیں اسی طرح ایک کلام کے بھی اجزائے ترکیبی ہوتے ہیں۔ اجمالی طور پر یہ چار اجزاء ہوتے ہیں —— عمود، تمہید، نفس مضمون اور خاتمہ۔

جہاں تک تمہید کا تعلق ہے، کلام کے شروع میں اسے لانے کی ضرورت عموماً اس وقت ہوتی ہے جب اس بات کا امکان ہو کہ مخاطب پر وہ بات مشکل ہو گی۔ لہٰذا اصل مقصود

کے لئے اس کو تیار کرنے کی خاطر تمہیدی بیان پہلے لایا جاتا ہے۔ اگرچہ تمہید کی بنیادی ضرورت یہی ہے لیکن کلام میں اس کے بے شمار دوسرے پہلو بھی ہیں۔ اس کی مقدار بھی مختلف ہو سکتی ہے اور اس سے فائدے بھی ان گنت حاصل کئے جاتے ہیں۔

تمہید کو اتنا طویل کرنا کہ وہ مقصود کلام کے بیشتر حصہ پر چھا جائے، پسندیدہ نہیں۔ لیکن ایک ماہر متکلم کلام کے مختلف طریقے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ بات کو اس طریقہ سے پھیر لے جائیگا جس کا مخاطبین کو سان گمان بھی نہ ہو گا۔ کبھی وہ تمہید کو طویل کر کے یا تو اپنا مقصود موزوں عبارت میں کہہ دے گا یا اسی تمہید کو اصل بات کہنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور کبھی وہ تمہید سے اصل مضمون کی طرف بتدریج آئے گا لیکن کلام کی تفصیل نہیں کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر مخاطب مطیع و معتقد ہے تو وہ تمہید کو ترک ہی کر دے یا اگر قہر و غضب کی حالت میں کوئی حکم دے تو مخاطب پر بجلی کی سی کڑک کے ساتھ ٹوٹ پڑے ان مواقع کی مثالیں تم سورۃ نور یا سورہ توبہ میں دیکھو گے یا پھر ان مواقع پر دیکھو گے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب کیا گیا ہے۔

کوائف مدارس عربیہ مغربی پاکستان

دینی مدارس کی تاریخ اور جائزہ

مغربی پاکستان کے دینی مدارس کی تاریخ جائزہ اور اعداد و شمار ساڑھے آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب پہلی بار دو سال قبل شائع ہوئی تھی۔ ملک اور بیرون ملک میں بندہ کی اس خدمت کو سراہا گیا۔ اس وقت دو ہزار کے قریب مدارس کے کوائف بیان ہوئے تھے۔ دو سال کے دوران نئے مدارس قائم ہو گئے ہیں۔ اس عرصہ میں کچھ قدیم مدارس نے بھی ترقی کے کئی مراحل طے کر لئے ہیں —— ان حالات میں ضروری ہو گیا کہ تمام قدیم و جدید مدارس کی تاریخ از سر نو مرتب کروں۔

جن مدارس کے پتے معلوم ہو سکے اس مقصد کے لئے انہیں تیرہ سو کے قریب سوالنامے روانہ کر چکا ہوں جنہیں نہ ملے ہوں اس پتے سے بلا قیمت طلب فرمائیں۔

حافظ نذر احمد۔ نذر منزل۔ ۱۰۱ محمد نگر۔ علامہ اقبال روڈ۔ لاہور

مقالات

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

اسلام اور انسانی حقوق

(۳)

تقلید کی ممانعت

جس طرح اسلام نے غور و فکر کی تعلیم اس لئے دی ہے تاکہ انسان سوچ بچار کے بعد صحیح راستہ اختیار کرے اسی طرح وہ تقلید اور ذہنی غلامی یعنی غور و فکر سے کام نہ لینے کو سخت ناپسند کرتا ہے اس کے نزدیک تمام خرابیوں اور برائیوں کا یہی سرچشمہ ہے۔ اسی مہلک مرض کا شکار ہو کر آدمی کفر و شرک، ضلالت و گمراہی اور زوال و ادبار کے عمیق غار میں گر جاتا ہے۔ ایجاد و ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ یہی ہے۔ اس سے تحقیق و اجتہاد ترقی و انکشاف اور ایجاد و اختراع کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تقلید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو کند و مفلوج اور ذہن و فکر کو ماؤف و معطل کر دے اور صحیح و غلط کی تمیز کے بغیر صرف اسی پر اکتفا کرے جو اس کے آباؤ اجداد یا قدیم رسم و رواج سے اسے ملا ہے۔ دنیا کی زندہ قومیں جو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہیں ہمیشہ تقلید سے گریز کرتی اور غور و فکر اور عقل و بصیرت سے کام لیتی ہیں۔ لیکن مردہ قومیں تقلید کا سہارا لیتی ہیں اور کامرانی کی منزل سے دور ہوتی جاتی ہیں۔

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بتقدیر می کنند

اقبال کو بھی اسی لئے بجا طور پر شکوہ تھا۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ چلنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حقیقت یہ ہے کہ تقلید اور قدیم رسم و رواج کی غلط محبت سے زیادہ خطرناک اور مہلک کوئی چیز نہیں اسی لئے اسلام نے اسے بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔ کفر و شرک اور ضلالت کا اولین سبب یہی ہے کہ آدمی نہ اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور نہ اپنے غلط اور گمراہ کن موقف

پر ایک لمحہ کے لئے نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم الہلال میں تقلید کو انسانی ضلالت کا اصل مبداء قرار دیتے ہوئے کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔

"ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لئے پہلی منزل تقلید کی بندشوں کو توڑنا ہے۔ کیونکہ تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں ان سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے اس لئے راہ اصلاح کا اولین منظر یہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسان کو نجات حاصل ہو۔ خدا تعالےٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے..... تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آباؤ اجداد کے طریق و رسوم پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے اور صرف انہیں کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت کو بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اس کی حالت بالکل ایک چوپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و تعقل کی تمام علامتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصلی شرف نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکر اور اجتہاد و تجسس ہے۔ دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانین الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اٹھے، اشیاء کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے، غرضیکہ انسان کے ارتقائے ذہنی و فکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آ رہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں، لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشو و نما کا دائمی سد باب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت اس کا اصلی مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے۔ بت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباء و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن نے اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا، مقلدین محض کو چارپایوں اور حیوانوں سے تشبیہ دی اور پھر اس کو بھی اظہار ضلالت کے لئے ناکافی قرار دے کر اس سے بھی بدتر فرمایا۔"

مقالات

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

اسلام اور انسانی حقوق

(۳)

تقلید کی ممانعت

جس طرح اسلام نے غور و فکر کی تعلیم اس لئے دی ہے تاکہ انسان سوچ بچار کے بعد صحیح راستہ اختیار کرے اسی طرح وہ تقلید اور ذہنی غلامی یعنی غور و فکر سے کام نہ لینے کو سخت ناپسند کرتا ہے اس کے نزدیک تمام خرابیوں اور برائیوں کا یہی سرچشمہ ہے۔ اسی مہلک مرض کا شکار ہو کر آدمی کفر و شرک، ضلالت و گمراہی اور زوال و ادبار کے عمیق غار میں گر جاتا ہے۔ ایجاد و ترقی کی راہ کا سب سے بڑا روڑہ یہی ہے۔ اس سے تحقیق و اجتہاد ترقی و انکشاف اور ایجاد و اختراع کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ تقلید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو گنگ و مفلوج اور ذہن و فکر کو ماؤف و معطل کر دے اور صحیح و غلط کی تمیز کے بغیر صرف اسی پر اکتفاء کرے جو اس کے آباؤ اجداد یا قدیم رسم و رواج سے اسے ملا ہے۔ دنیا کی زندہ قومیں جو ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہیں ہمیشہ تقلید سے پرہیز کرتی اور غور و فکر اور عقل و بصیرت سے کام لیتی ہیں۔ لیکن مردہ قومیں تقلید کا سہارا لیتی ہیں اور کامرانی کی منزل سے دور ہوتی جاتی ہیں۔

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست
قومے دگر حوالہ بتقدیر می کنند

اقبال کو بھی اسی لئے بجا طور پر شکوہ تھا ؎

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

حقیقت یہ ہے کہ تقلید اور قدیم رسم و رواج کی غلط محبت سے زیادہ خطرناک اور مہلک کوئی چیز نہیں اسی لئے اسلام نے اسے بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔ کفر و شرک اور ضلالت کا اولین سبب یہی ہے کہ آدمی نہ اپنی جگہ سے ہٹنے کے لئے تیار ہوتا ہے اور نہ اپنے غلط اور گمراہ کن موقف

پر ایک لمحہ کے لئے نظر ثانی کرنا چاہتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم الہلال میں تقلید کو انسانی ضلالت کا اصل مبداء قرار دیتے ہوئے کیا خوب تحریر فرماتے ہیں۔

"ہر اصلاحی تحریک و دعوت کے لئے پہلی منزل تقلید کی بندشوں کو توڑنا ہے۔ کیونکہ تقلید کے اہرمن سے بڑھ کر انسان کی تمام یزدانی خصائل کا اور کوئی دشمن نہیں۔ انسانی اعمال کی جس قدر گمراہیاں ہیں ان سب کی تخم ریزی صرف تقلید ہی کی زمین میں ہوتی ہے اس لئے راہ اصلاح کا اولین منظریہ ہے کہ تقلید پرستی کے سلاسل و اغلال سے انسان کو نجات حاصل ہو، خدا تعالیٰ نے ہر انسانی دماغ کو سوچنے والا اور ہر آنکھ کو دیکھنے والا بنایا ہے ..... تقلید سے پہلی ہلاکت جو انسانی دماغ پر چھا جاتی ہے وہ یہی ہے کہ انسان اپنے چند پیشواؤں اور مقتداؤں کی تعلیم یا آباؤ اجداد کے طرق و رسوم پر اپنے آپ کو چھوڑ دیتا ہے اور صرف انہیں کا تعبد کرتے کرتے خود اپنی قوتوں سے کام لینے کی عادت کو بھول جاتا ہے۔ اس عالم میں پہنچ کر اس کی حالت بالکل ایک چوپائے کی سی ہو جاتی ہے اور انسانی ادراک و تعقل کی تمام علامتیں مفقود ہونے لگتی ہیں۔ انسان کا اصلی شرف نوعی اور مابہ الامتیاز اس کے دماغ کا تدبر و تفکر اور اجتہاد و تجسس ہے دنیا میں جس قدر علوم و فنون کا انکشاف ہوا، قوانین الٰہیہ اور نوامیس فطریہ کے چہروں سے جس قدر پردے اٹھے، اشیاء کائنات کے خواص کا جو کچھ سراغ لگا، تمدن و مصنوعات میں جس درجہ ترقیاں ہوئیں، نئے نئے آلے اور نئے نئے وسائل راحت جس قدر ایجاد ہوئے، غرضیکہ انسان کے ارتقائے ذہنی و فکری کے جس قدر کرشمے دنیا میں نظر آ رہے ہیں، یہ تمام تر اسی انسانی تفکر و تدبر کے نتائج ہیں، لیکن تقلید پرستی کی عادت ہلاکت و بربادی کی ایک چٹان ہے جو انسانی تفکر و تدبر اور ادراک و تعقل کی تمام قوتوں کو کچل ڈالتی ہے اور اس کی قوت نشو و نما کا دائمی سد باب کر دیتی ہے۔ قرآن کریم جس دعوت کو لے کر آیا فی الحقیقت اس کا اصلی مقصد یہی تھا کہ تقلید اور استبداد فکری کی زنجیروں سے انسان کو نجات دلائے۔ بت پرستی اور انسان پرستی کی تمام شاخیں بھی اسی تقلید آباء و رسوم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن نے اپنی تعلیم توحید کا اساس بھی انسان کی اجتہاد فکری پر رکھا اور تفکر پر زور دیا۔ افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالہا، مقلدین محض کو چارپایوں اور حیوانوں سے تشبیہ دی اور پھر اس کو بھی اظہار ضلالت کے لئے ناکافی قرار دے کر ان سے بھی بدتر فرمایا۔"

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حق و صداقت سے بعد، خدا پرستی سے انحراف اور ضلالت و گمراہی میں پڑ جانے کا واحد سبب یہی ہوا ہے کہ لوگوں نے رسم و رواج اور آباؤ اجداد کی غلط اور اندھی پیروی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ انبیاء و رسل کی تکذیب و استہزاء کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ جب بھی خدا کے پیغمبروں نے راہ راست کی طرف بلایا اور عقل و فکر سے کام لینے پر زور دیا تو مقلدین اور مسلک آباء و اجداد کے شیفتگان نے عقل و فہم اور تجربہ کے واضح اور صریح فیصلوں کے خلاف یہی دلیل دی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (زخرف ۲۳)

اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے بھی جب کسی ڈرانے والے کو کسی بستی میں بھیجا تو وہاں خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کی تقلید کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی قوم کی بت پرستی کے خلاف نکیر کرتے ہوئے فرمایا:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِىْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (انبیاء ۵۲)

یہ کیسی تصویریں ہیں جن کے آگے تم جھکتے ہو۔

تو انہیں جواب ملا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (انبیاء ۵۳)

انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہیں کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔

قیامت میں گم کردہ راہ لوگ اپنی ضلالت و گمراہی پر نادم و شرمندہ ہونے کے ساتھ ہی یہ عذر لنگ بھی پیش کریں گے کہ:

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (احزاب ۶۷)

ہم نے اپنے اکابر اور لیڈروں کی بات مانی پس انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

مسلمانوں کی موجودہ فکری و عملی گمراہی اور علم و فن میں ان کا روز بروز انحطاط بھی ان کے جمود و تعطل اور فکر و تحقیق سے بیگانگی کا نتیجہ ہے۔ مولانا ابو الکلام نے ترجمان القرآن میں اس پر ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ ذوق ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی اس داء عضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ وہ نویں صدی کی تفسیروں تک برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے کسی نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چند لموں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیوں کو دیکھو کہ ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے۔ دیباچہ جلد اول

قرآن مجید کی بنیاد تمام تر عقل پر ہے۔ یہ مسلمات اور ثابت شدہ حقائق کو بھی بیان کرتا ہے تو دلائل اور شواہد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد کا تذکرہ اس میں جملہ وجوہ و علل کے ساتھ ہوا ہے۔ نجات و سعادت کی راہیں بتائی گئی ہیں تو ان کے اسباب و دلائل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دین حق کی تبلیغ و ہدایت پر مامور تھے اسے آپ نے پوری بصیرت، کامل اطمینان اور نہایت شرح صدر کے بعد اختیار کیا تھا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ (یوسف) قرآن مجید کفار و مشرکین کے شرک و بت پرستی، یہود و نصاریٰ کی ضلالت اور حق پرستی سے دیدہ و دانستہ انحراف اور دوسرے مذاہب اور فرقوں کی عام گمراہیوں کے خلاف آواز اٹھاتا اور ان کے عقائد فاسدہ اور افکار باطلہ کا رد کرتا ہے تو برہان و استدلال سے کرتا ہے۔ وہ اسلام کی حقانیت اور قرآن کی صداقت کو بھی زبردستی اور دھاندلی سے نہیں منواتا۔ لیکن اگر واضح دلائل اور صریح شہادتوں کے بعد کوئی قلب ایمان کا لذت شناس نہیں ہوتا اور اس کی چشم مست کو سراج منیر کی روشنی نظر نہیں آتی اور نہ اس کے کانوں میں صدائے حق کی دلکشی گھر کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہے اور اس نے اپنی قوت فکر و عمل اور صلاحیت ادراک و تعقل کو مفلوج کر دیا ہے اس نے اس میں اور چوپایوں میں کوئی فرق نہیں بلکہ وہ ان سے بھی بدتر

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ حق و صداقت سے بعد، خدا پرستی سے انحراف اور ضلالت و گمراہی میں پڑ جانے کا واحد سبب یہی ہوا ہے کہ لوگوں نے رسم و رواج اور آباؤ اجداد کی غلط اور اندھی پیروی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ انبیاء و رسل کی تکذیب و استہزاء کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ جب بھی خدا کے پیغمبروں نے راہِ راست کی طرف بلایا اور عقل و فکر سے کام لینے پر زور دیا تو مقلدین اور مسلک آباء و اجداد کے شیفتگان نے عقل و فہم اور تجربہ کے واضح اور صریح فیصلوں کے خلاف یہی دلیل دی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ (زخرف ۲۳)

اور ایسے ہی ہم نے تم سے پہلے بھی جب کسی ڈرانے والے کو کسی بستی میں بھیجا تو وہاں خوشحال لوگوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم ان کے آثار کی تقلید کر رہے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنی قوم کی بت پرستی کے خلاف نکیر کرتے ہوئے فرمایا:

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِىْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (انبیا ۵۲)

یہ کیسی تصویریں ہیں جن کے آگے تم جھکتے ہو۔

تو انہیں جواب ملا۔

قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (انبیاء ۵۳)

انہوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو انہیں کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے۔

قیامت میں گم کردہ راہ لوگ اپنی ضلالت و گمراہی پر نادم و شرمندہ ہونے کے ساتھ ہی یہ عذرِ لنگ بھی پیش کریں گے کہ:

اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (احزاب ۶۷)

ہم نے اپنے اکابر اور لیڈروں کی بات مانی پس انہوں نے ہمیں گمراہ کیا۔

مسلمانوں کی موجودہ فکری و عملی گمراہی اور علم و فن میں ان کا روز بروز انحطاط بھی ان کے جمود و تعطل اور فکر و تحقیق سے بیگانگی کا نتیجہ ہے۔ مولانا ابوالکلام نے ترجمان القرآن میں اس پر ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے۔

چوتھی صدی ہجری کے بعد علوم اسلامیہ کی تاریخ کا مجتہدانہ ذوق ختم ہو گیا اور شواذ و نوادر کے علاوہ عام شاہراہ تقلید کی شاہراہ ہو گئی۔ اس دارالعضال نے جسم تفسیر میں بھی پوری طرح سرایت کی۔ ہر شخص جو تفسیر کے لئے قدم اٹھاتا کسی پیشرو کو اپنے سامنے رکھ لیتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا۔ اگر تیسری صدی ہجری میں کسی مفسر سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو ضروری ہے کہ وہ نویں صدی کی تفسیروں تک برابر نقل در نقل ہوتی چلی آئے کسی نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ چند لمحوں کے لئے تقلید سے الگ ہو کر تحقیق کرے کہ معاملہ کی اصلیت کیا ہے۔ رفتہ رفتہ تفسیر نویسی کی ہمتیں اس قدر پست ہو گئیں کہ کسی متداول تفسیر پر حاشیہ چڑھا دینے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ بیضاوی اور جلالین کے حاشیوں کو دیکھو کہ ایک بنے ہوئے مکان کی لیپ پوت کرنے میں کس طرح قوت تصنیف رائگاں گئی ہے۔ (دیباچہ جلد اول ۱۹۴۱ء)

قرآن مجید کی بنیاد تمام تر عقل پر ہے۔ یہ مسلمات اور ثابت شدہ حقائق کو بھی بیان کرتا ہے تو دلائل اور شواہد کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور معاد کا تذکرہ اس میں جملہ وجوہ و علل کے ساتھ ہوا ہے۔ نجات و سعادت کی راہیں بتائی گئی ہیں تو ان کے اسباب و دلائل کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس دین حق کی تبلیغ و ہدایت پر مامور تھے اسے آپ نے پوری بصیرت، اکمل اطمینان اور نہایت شرحِ صدر کے بعد اختیار کیا تھا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِىْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۟ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِىْ (یوسف) قرآن مجید کفار و مشرکین کے شرک و بت پرستی، یہود و نصاریٰ کی ضلالت اور حق پرستی سے دیدہ و دانستہ انحراف اور دوسرے مذاہب اور فرقوں کی عام گمراہیوں کے خلاف آواز اٹھاتا اور ان کے عقائدِ فاسدہ اور افکارِ باطلہ کا رد کرتا ہے تو برہان و استدلال سے کرتا ہے۔ وہ اسلام کی حقانیت اور قرآن کی صداقت کو بھی زبردستی اور دھاندلی سے نہیں منواتا۔ لیکن اگر واضح دلائل اور صریح شہادتوں کے بعد کوئی قلب ایمان کا لذت شناس نہیں ہوتا اور اس کی چشمِ مست کو سراجِ منیر کی روشنی نظر نہیں آتی اور نہ اس کے کانوں میں صدائے حق کی دلکشی گھر کرتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ضدی اور ہٹ دھرم ہے اور اس نے اپنی قوت فکر و عمل اور صلاحیت ادراک و تعقل کو مفلوج کر دیا ہے اس لئے اس میں اور چوپایوں میں کوئی فرق نہیں بلکہ وہ ان سے بھی بدتر

اور گمراہ کردہ راہ ہے۔

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (اعراف ۱۷۹)

اور ہم نے دوزخ کے لئے اکثر جن و انس پیدا کئے جن کے دل ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں۔ آنکھیں ہیں تو ان سے دیکھتے نہیں اور کان ہیں تو ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی طرح سے ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ اور یہی لوگ در اصل غافل اور بے خبر ہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہو گا۔ کہ قرآن مجید کو انسان کی آزادیٔ فکر کا کس درجہ خیال ہے اور وہ اسے کسی حال میں پسند نہیں کرتا کہ آدمی اپنی عقل و فہم کو استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ باقی رکھے اور تقلید کا سہارا لے۔

رسول اکرم بھی داعیٔ فکر و نظر تھے

جس طرح قرآن مجید سراپا دعوت فکر و نظر ہے اسی طرح اس کا حامل اور شارح بھی عقل انسانی کا مربی اور اسے فقہ و اجتہاد اور استدلال و بصیرت کی بہترین صلاحیت بخشنے والا اور غور و خوض اور فکر و نظر کی اہمیت بتانے والا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف اسالیب سے فقہ و تعقل کی دعوت دی ہے، فرمایا:۔ من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین (جس کے ساتھ خدا بھلا کرنا چاہتا ہے اسے فقہ و اجتہاد کی صلاحیت بخشتا ہے) ایک مرتبہ آپ نے لوگوں سے فقہ و بصیرت اور دین و حکمت کی باتیں سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا۔ فرب حامل فقہ الی من ھو افقہ منہ (یعنی سمجھ کی بات کے بعض متحملین اسے اپنے سے زیادہ سمجھدار کے حوالہ کرتے ہیں۔

بعض اوقات آپ صحابہؓ سے مخفی امور کی مناسبتیں دریافت کرتے اور اس قسم کے سوالات کرتے تھے جن سے ان کا دماغ غور و فکر کا عادی بنے چنانچہ ایک مرتبہ دریافت فرمایا کہ "درختوں میں کونسا درخت مومن سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے" آپ نے عبادت و ریاضت کے کاموں کو سوچ سمجھ کر ادا کرنے کی تاکید کی۔ فرمایا:۔

الا لا خیر فی عبادۃ لیس فیہا تفقہ ولا علم لیس فیہا تفہم ولا قراءۃ لیس فیہا تدبر۔ آگاہ رہو کہ جس عبادت میں سمجھ اور جس علم میں فہم اور جس پڑھنے میں تدبر شامل نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

حضرت معاذؓ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ اگر تمہارے پاس کوئی معاملہ فیصلہ کے لئے آئیگا تو کیا کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کرونگا۔ آپ نے پوچھا اگر اس میں اس مسئلہ کا حل نہ ملا تو کیا کرو گے؟ جواب دیا۔ خدا کے رسول کی سنت میں اسے تلاش کروں گا۔ آپ نے پوچھا اگر سنت سے بھی وہ مسئلہ حل نہ ہوا تو؟ حضرت معاذؓ نے کہا۔ اجتھد برأیی ولا آلو (اپنی فہم اور سوجھ بوجھ کے مطابق اجتہاد کروں گا اور پوری کوشش و کاوش سے کام لوں گا۔) آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ جواب بہت پسند آیا اور آپ نے نہایت مسرور ہو کر فرمایا۔ الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضاہ (اس خدا کا شکر ہے جس نے رسول اللہ کے ایلچی کو اس بات کی توفیق دی جو اسے پسند ہے)

قرآن مجید کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی لوگوں کے سامنے مسلمات، حقائق، حجج براہین اور دلائل و شواہد رکھتے تھے تاکہ وہ کامل غور و فکر کے بعد کوئی راہ اختیار کریں اگر دین کی دعوت پر لبیک کہیں تو اس لئے کہ ان کی عقل کو بھی وہ اپیل کر رہی ہو، اگر اسلام قبول کریں تو اس لئے کریں ان کے دل کی آواز ہو، خیر کی طرف ان کا رجحان اس لئے ہو کہ ان کا ضمیر اس کا مطالبہ کرے۔ برائی سے نفرت کریں تو اس لئے کہ ان کا شعور بھی اس سے نفرت کر رہا ہو، شرک و ظلم سے پرہیز کریں تو اس لئے کہ ان کا ادراک و تعقل انہیں اس سے پرہیز کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔ غرضیکہ رد و قبول اور ترک و اختیار کے ہر معاملہ میں خود ان کا دل اور ان کی عقل پورے طور سے مطمئن ہو۔ اسی مفہوم کو آپ نے اپنے جامع الفاظ میں اس طرح ادا فرمایا ہے:۔

لا یکون احدکم امعۃ یقول انا مع الناس ان احسن الناس احسنت وان اساؤا اسأت ولکن وطنوا انفسکم ان احسن

تم میں سے کوئی شخص طفیلی بن کر یہ نہ کہے کہ میں لوگوں کے ساتھ ہوں اگر وہ اچھا کام کریں گے تو میں بھی اچھا کروں گا اور اگر برائی کریں گے تو میں بھی برائی

الناس ان تحسنوا وان اساءوا ان تجتنبوا اساءتھم

کرونگا، بلکہ تمہیں اس بات کا عادی بننا چاہیے کہ اگر لوگ اچھا کرینگے تو تم بھی اچھا کرو، اور اگر وہ برا کریں تو تمہیں ان کے سوء سے بچنا چاہیے۔

اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق کی تلاش میں اگر آدمی کی فکر و تحقیق اگر غلط بھی ہو جائے تو اس پر بھی آدمی کو ایک اجر ملے گا۔ باقی رہے وہ لوگ جنکا اجتہاد درست ہوتا ہے ان کے لئے دوہرا اجر رکھا گیا ہے۔ علم کی تحصیل پر بھی اس لئے زور دیا گیا ہے کہ اس سے غور و فکر، استدلال و استنباط اور نظر و بصیرت کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ علم اگر صحیح ہے تو اس سے صحیح فکر پیدا ہوگا اور اس طرح حقیقت حال تک رسائی اور خدا کی معرفت و خشیت حاصل ہوگی۔

غور فرمائیے قرآن کا حامل و شارح کس طرح فکر و نظر کی دعوت دیتا اور عقل انسانی کی تربیت کرتا ہے۔ اس کا منشا انسان کے فکر و خیال کی آزادی نہیں تو کیا ہے؟

صحابہ اور آزادیٔ فکر

جن لوگوں کو رسول کریم کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملا ہے اور آپ نے ان کی عقلی و ذہنی تربیت فرمائی ہے۔ ان کے ارشادات سے بھی عقل و فہم سے کام لینے کی اہمیت اور اس کے بالمقابل تقلید اور پابندی رسم و رواج کی شناعت ظاہر ہوتی ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اور قرآن کی روح سمجھنے والوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی کو مکمل اسوہ اور نمونہ بنانے والوں کے نزدیک بھی انسان کی آزادیٔ فکر کی بہت اہمیت ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے صرف اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے کہ خلفائے راشدین کبھی اپنی ذاتی رائے اور فیصلہ کو کسی پر تھوپنا نہیں چاہتے تھے بلکہ تمام امور و مسائل اور مہمات میں عام صحابہ سے مشورہ کے بعد ہی کوئی فیصلہ صادر کرتے تھے۔

یوں بھی اس زمانہ میں آدمی کا فکر جس طرف اس کی رہنمائی کرتا تھا، انفرادی طور پر وہ اسی پر عمل کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور قاضی شریح کو خطوط لکھے تو ان میں انہیں فقہ و بصیرت اور اجتہاد و تفقہ سے کام لینے کی تلقین کی۔ ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام جو خط لکھا تھا اس کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں۔

واعرف الاشباہ والامثال وقس الامور

(اشیاء کے مابین) مناسبتوں اور مشابہتوں کو سمجھو اور معاملات و امور میں درست اندازہ لگاؤ۔

حضرت علیؓ سے مروی ہے:

ایاکم والاستنان بالرجال

لوگوں کی تقلید اور نقل سے بچو۔

مشہور فقیہ اور جلیل القدر صحابی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے:

الا لا یقلدن احدکم دینہ رجلا ان آمن آمن وان کفر کفر فانہ لا اسوۃ فی الشر۔

خبردار! تم میں سے کوئی شخص اپنے دین کے معاملہ میں کسی کی تقلید نہ کرے کہ اگر وہ ایمان لائے تو میں بھی ایمان لاؤنگا اور اگر وہ انکار کرے تو میں بھی انکار کرونگا کیونکہ شر میں تقلید درست نہیں۔

ایک بزرگ عبد اللہ بن معتز کا ارشاد ہے۔

لافرق بین بھیمۃ تنقاد و انسان یقلد[1]

مطیع اور باگ میں لگے ہوئے چوپائے اور مقلد انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

ان ارشادات کا اس کے سوا اور کوئی منشا نہیں ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو جو دل و دماغ دیا ہے تو اسے اس سے سوچنا، سمجھنا اور غور کرنا چاہیئے۔ دوسرے کی فکر و بصیرت کا بلاوجہ پابند نہ ہو اور اپنے ذہن و عقل کو زنگ آلود ہونے سے بچائے۔

مسلمانوں میں جب فکر و نظر، غور و خوض، استدلال و استنباط اور فقہ و بصیرت سے کام لینے کا عام مذاق و رواج تھا اس وقت علم و فن کے ساتھ ساتھ خود وہ بھی ترقی کر رہے تھے، لیکن جب سے تجسس و تلاش اور جستجو و تحقیق سے کام لینا بند کر دیا گیا ہے ہر قسم کی خرابیاں اور گمراہیاں ان میں گھر کرتی جا رہی ہیں۔ سب سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ جن ائمہ و فقہاء کی تقلید کو جزو ایمان سمجھ لیا گیا ہے اور اپنے محبوب مسلک کی حقانیت اور متعین امام کی عصمت پر بحث و جدال کے بڑے بڑے معرکے سر کئے جا رہے ہیں خود انہوں

[1] یہ روایات و آثار اکثر علامہ ابن البر کی جامع بیان العلم و فضلہ اور حافظ ابن قیم کی اعلام الموقعین سے نقل کئے گئے ہیں (ضیاء)

نے کبھی اپنی اندھی تقلید کی اجازت نہیں دی۔ امام مالکؒ کا مشہور قول ہے "بجز رسول خدا کے ہر شخص کے قول میں رد و بدل کی گنجائش ہے۔" امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ میرے قول کے مقابلہ میں اگر کوئی حدیث تمہیں مل جائے تو اسے اختیار کر لو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔" امام ابوحنیفہؒ کا ارشاد ہے کہ "صحابہ کے بعد جن لوگوں کے اقوال پیش کئے جاتے ہیں ان میں تو بہر حال نظر و فکر کی گنجائش ہے۔ کیونکہ نحن رجال وہم رجال۔" خود آپ نے اپنے مسلک کو بلا دلیل ماننے کی اجازت نہیں دی۔ آپ کے دو عزیز شاگردوں سے زیادہ بڑھ کر کون آپ کا قدرداں ہو سکتا ہے لیکن ان دونوں نے کئی مسائل میں اپنے شیخ سے اختلاف کیا اور امام ابویوسفؒ نے تو ایک معاملہ میں اپنے امام کے مسلک کو ترک اور امام مالک کے مسلک کو اختیار کرتے ہوئے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "اگر آج امام ابوحنیفہؒ زندہ ہوتے اور ان کے سامنے یہ دلائل ہوتے تو وہ اپنے مسلک سے میری طرح رجوع کر لیتے۔" ان آئمہ کی بے تعصبی اور حق پرستی کا یہ حال تھا کہ وہ کبھی اپنے قول کی پچ نہ کرتے اور جب کسی معاملہ میں انہیں اپنی غلطی معلوم ہو جاتی تو وہ اسے چھوڑ کر اس راہ کو اختیار کر لیتے جس کی عقل و نقل سے دلیل مل جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سلف میں مقلد کو عالم کہنے کا رواج نہ تھا۔ ابن البر اور ابن قیم دونوں نے اس پر بحث کی ہے۔ علامہ ابن قیم کے الفاظ یہ ہیں:

ولا خلاف بين الناس ان التقليد ليس لعلم وان المقلد لا يطلق عليه اسم عالم۔

اس بات میں کہ تقلید علم اور مقلد پر عالم کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

(اعلام الموقعین ج اول ص)

یہاں چونکہ تقلید کا اصطلاحی لفظ زیر بحث آ گیا ہے اس لئے یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے علماء نے تقلید کو جائز قرار دیا ہے۔ لیکن تقلید کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو بیکار بنائے اور ذہن و فکر پر تالا لگا لے۔ دین کے معاملات میں جو تقلید کی جاتی ہے اسے اتباع کہا جا سکتا ہے اور وہ جائز بھی ہے۔ تقلید اور اتباع کے درمیان فرق ابوعبداللہ بن خویز منداد سے یوں منقول ہے۔

التقليد معناه في الشرع الرجوع الى قول لا حجة لقائله عليه وذلك ممنوع منه في الشريعة والاتباع ما ثبت عليه حجة وقال في موضع آخر من كتابه كل من اتبعت قوله من غير ان يجب عليك قوله لدليل يوجب ذلك فانت مقلده والتقليد في دين الله غير صحيح وكل من اوجب عليك الدليل اتباع قوله فانت متبعه والاتباع في الدين مسوغ والتقليد ممنوع

(جامع ابن عبد البر [illegible])

شریعت میں تقلید کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسی بات کو اختیار کر لیا جائے جس کی کوئی حجت اس کے کہنے والے کے پاس نہ ہو اور یہ شریعت میں ممنوع ہے اور اتباع اسے کہتے ہیں جس کے ثبوت میں دلیل موجود ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں ایک اور مقام پر لکھا ہے کہ اگر تم کسی شخص کی بات مانو گے جس کے قائل کے پاس کوئی دلیل نہ ہو تو تم اس کے مقلد کہلاؤ گے اور دین الٰہی میں تقلید صحیح نہیں ہے لیکن جب شخص نے تم سے اپنی بات دلیل کے ساتھ منوائی تو تم اس کے متبع کہلاؤ گے اور اتباع دین میں جائز اور تقلید ممنوع ہے۔

تقلید و اجتہاد کی فقہی بحث ہمارا موضوع نہیں لیکن اس قدر تفصیل اس لئے کی گئی ہے تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اسلام انسان کو فکر و نظر کی آزادی کا عظیم حق بخشتا ہے جبکہ دوسرے مذاہب میں اس حق کا کوئی احترام نہیں کیا گیا ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ، عقل و فہم اور ذہن سے کام لے، انہیں سوچنے سمجھنے کا عادی بنائے، اور انہیں مفلوج اور بیکار بنانے سے احتراز کرے۔ (باقی)

عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ

عائلی مسائل مثلاً طلاق۔ تعدد ازواج وغیرہ پر مولانا امین احسن اصلاحی کی تحقیقی اور معرکۃ الآرا تصنیف۔

قیمت دو روپے پچیس پیسے (علاوہ محصول ڈاک)

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ میثاق۔ رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور ۱۲

اقتباسات و تراجم

جناب خالد مسعود صاحب

تہذیبِ مغرب کا ثمرہ۔ کثرتِ طلاق

یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ مشرقی روایات رکھنے والے ممالک کی نسبت مغربی ممالک میں طلاق زیادہ عام ہے۔ اسے دیکھ کر ایک خیال تو یہ ہوتا ہے کہ شاید مغربی ممالک کی روایات ہی کا یہ ثمر ہے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صرف مغربی ممالک ہی نہیں بلکہ وہ مشرقی ممالک بھی جہاں مغربی تہذیب کے اثرات پہنچ گئے ہیں کثرتِ طلاق کے مسئلہ سے دوچار ہیں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ مغرب کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ کثرتِ طلاق بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ ہو یا ایشیاء اور افریقہ، ہر خطے کے "ترقی یافتہ" ممالک میں نکاح کے بندھنوں کا کوئی احترام باقی نہیں رہ گیا ہے۔

مغربی تہذیب کے یہ اثرات کیوں مرتب ہوتے ہیں؟ "ترقی یافتہ" ممالک کے مرد و زن نکاح کو احترام کی نگاہوں سے کیوں نہیں دیکھتے؟ طلاق کی کثرت کے اسباب کیا ہیں؟ یہ اور اس طرح کے بے شمار سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں، ان کا عموماً یہ جواب دیا جاتا ہے کہ مغربی تہذیب مرد و زن میں مساوات کی علمبردار ہے۔ وہاں کی عورت آزاد ہے۔ وہ شوہر کی غلام نہیں۔ اسی لئے نکاح اسی وقت تک قائم رکھا جاتا ہے جب تک میاں بیوی ایک دوسرے سے مطمئن ہوں۔ جب اطمینان ختم ہو جاتا ہے تو رشتہ مناکحت بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

ان سوالوں کا یہ جواب اگرچہ صحیح ہے تاہم مکمل صورت حال کو نگاہوں کے سامنے نہیں لاتا۔ امریکہ کے بین الاقوامی رسالہ لائف میں کچھ عرصہ پیشتر ایک سلسلہ مضامین شائع ہوا تھا جس میں مضمون نگار نے امریکہ میں اس مسئلہ کے خد و خال واضح کئے تھے۔ یہ مضمون بھی اگرچہ

کچھ زیادہ مکمل نہیں تاہم اس کے بین السطور سے کچھ اہم نکات تلاش کرنا مشکل نہیں۔

امریکہ میں کثرتِ طلاق کی سنگینی واضح کرنے کے لئے لائف کے مضمون نگار نے ایک ماہر شماریات ڈاکٹر جیکب سن کا اندازہ یہ بتایا ہے کہ امریکہ میں ڈیڑھ کروڑ مرد و عورت طلاق یافتہ ہیں اور اٹھارہ برس سے کم عمر کے چالیس لاکھ بچے وہاں ایسے ہیں جن کے والدین ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ایک صدی پیشتر سنہ ۱۸۶۱ء میں امریکہ میں ساڑھے چھ ہزار طلاقیں ہوئیں۔ اس سے پچاس برس بعد سنہ ۱۹۱۱ء میں طلاقوں کی تعداد نوے ہزار تھی...... سنہ ۱۹۶۱ء کے دوران ملک میں چار لاکھ طلاقیں واقع ہوئیں اور سالِ رواں کے بارے میں ماہرینِ شماریات کی پیشگوئی یہ ہے کہ ہر چار میں سے ایک شادی کا خاتمہ طلاق کی شکل میں ہوگا۔ کثرتِ طلاق کا مسئلہ امریکہ میں اتنا پیچیدہ ہو گیا ہے کہ جگہ جگہ مشیرانِ شادی کے دفاتر کھل رہے ہیں۔ اخباروں میں ناخوش جوڑوں کے لئے ہدایات ملتی ہیں۔ صرف لاس اینجلز کی ٹیلیفون ڈائرکٹری میں دو صفحات اور تین کالم مشیرانِ شادی کے اشتہارات کی نذر ہو جاتے ہیں۔

کثرتِ طلاق کا جہاں یہ عالم ہو وہاں رشتۂ مناکحت کے احترام کا تصور کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ اسی صورت حال کا ایک دلچسپ تجزیہ ایک ماہر عمرانیات نے یوں کیا کہ

"لوگ یہاں شادی شدہ ہیں، مگر وہ لازماً سال یا دو سال پیشتر کی بیویوں ہی کے شوہر نہیں۔ کبھی کبھی میرا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم کہنے کی جرأت کریں یا نہ کریں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ ہماری پوری قوم نے تجرباتی شادیوں کا نظام اپنا لیا ہے۔ مرد ایک عورت سے نکاح کرتے ہیں جب اس سے جی بھر جاتا ہے تو اسے طلاق دے کر دوسری عورت سے شادی رچا لیتے ہیں۔"

خود ماہرینِ عمرانیات کے درمیان کثرتِ طلاق کے اسباب کی نشاندہی کے بارے میں اچھا خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک ماہر فریڈ جیکنڈر جس کے سامنے طلاق کے ساڑھے تین ہزار مقدمات پیش ہوئے کی رائے میں بیشتر طلاقیں ان جوڑوں میں واقع ہوئیں جن کی شادی کی ابتدا ہی ایسی تھی کہ اس کا نتیجہ سوائے طلاق کے کسی دوسری شکل میں نہیں نکل سکتا تھا۔

مثال کے طور پر بیشمار جوڑوں کو قبل از وقت شادی کے بندھن میں اس لئے آنا پڑا کہ

کورٹ شپ کے دوران ہی ترک جلد ہوگئی تھی۔ ایسی شادیوں کے لئے فریقین ذہنی طور پر تیار نہ تھے چنانچہ ازدواجی زندگی کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ تعلقات میں کشیدگی آئی اور بالآخر رشتۂ نکاح کاٹ دیا گیا۔ جیک نارمن کی رائے میں اس کے علاوہ مالی مشکلات، کمزوری صحت اور شراب نوشی کی عادت طلاق کا باعث بنی۔

ایک ماہر عمرانیات جان تھامس نے ایسی شادیوں کا مطالعہ کیا جو محض اتفاق یا مجبوری کے تحت نہیں ہوئی تھیں، بلکہ زوجین نے خوب غور و فکر اور رات دن کی دعاؤں کے بعد شادی کا قدم اٹھایا تھا۔ یہ جوڑے جلد بازی میں الگ نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے طلاق کا حتمی فیصلہ کرنے میں کافی وقت لیا۔ ان طلاقوں کی نوبت مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر عمل میں آئی۔

کثرت شراب خوری	۳۰ فی صد طلاقیں
زنا	۲۵ " " "
غیر ذمہ دارانہ رویہ	۱۲ " " "
اختلاف مزاج	۱۲ " " "

بعض لوگوں کے نزدیک کثرت طلاق کی ایک وجہ یہ ہے کہ طلاق بہت آسان چیز بنادی گئی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ طلاق لینا یا دینا سخت معیوب سمجھا جاتا تھا اور جن لوگوں سے یہ جرم سرزد ہوتا تھا ان کے متعلق معاشرے میں سرگوشیاں ہوا کرتی تھیں۔ اب صورت یہ ہے کہ عورت خود کما سکتی ہے، طلاق کے بعد اس کی حیثیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اگر زوجین کے مذہبی یا اخلاقی نظریات اور بچوں کا مسئلہ مانع نہ ہو تو کوئی طاقت اب میاں بیوی کو اکٹھے رہنے پر مجبور نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ خود اس طرح رہنے کے خواہشمند نہ ہوں۔

کثرت طلاق کے اسباب کے تعین میں اختلاف کے باوجود ماہرین شماریات چند باتوں پر متفق ہیں۔ مثلاً یہ کہ امریکہ کی یہودی یا کیتھولک آبادی میں طلاق کے واقعات شاذ و نادر پیش آتے ہیں۔ اس کا زیادہ تر مشاہدہ ان لوگوں میں ہوتا ہے جو مذہب کو فرسودہ اور بے مقصد چیز سمجھتے ہیں۔ اسی طرح شہری آبادی کی نسبت دیہی آبادی میں سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے طلاق کم ہوتی ہے۔

ترقی یافتہ دنیا کے اس مسئلہ کے اسباب میں جتنا کچھ اختلاف ہے اس کے باوجود یہ اندازہ

لگانا کچھ مشکل نہیں کہ طلاق کی اس کثرت کے پیچھے کونسے اہم عوامل کار فرما ہیں۔ معمولی غور و فکر کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ مغربی تہذیب جن اصولوں سے ترکیب پاتی ہے انہی کے برگ و بار میں سے یہ مسئلہ بھی ہے۔

یہ تہذیب مذہب کو ایک فرسودہ اور غیر عقلی چیز سمجھتی ہے۔ اس کے نزدیک کسی آدمی کا مذہبی ہونا اس کی بیوقوفی یا کم از کم پست ہمتی اور بزدلی کی دلیل ہے۔ مذہب، خاندان اور سوسائٹی کی تشکیل میں یا اجتماعی مسائل میں کوئی خاص کردار ادا کر سکتا ہے، یہ تہذیب اس کی قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب نے اپنی معاشرت کو بالکل الگ اصولوں پر اٹھایا ہے اور قدرتی طور پر یہاں نکاح و طلاق اور زوجین کے حقوق و فرائض کا تصور وہ نہیں جو مذہب اپنے پیروکاروں کو دیتا ہے۔ یہاں مرد و عورت دونوں کو اپنی مرضی کا کردار ادا کرنے کی اجازت ہونی چاہئیے۔ اگر اس پر کوئی قدغن لگائی جائے تو وہ ایک دوسرے کو قابل قبول نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے جہاں آزادی بے اصولی کا نام ہو وہاں یہ مسائل اگر روز افزوں ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

مذہب کا فرد و اجتماع کے سنوارنے میں کتنا ہاتھ ہے؟ وہ مندرجہ بالا اس بیان سے واضح ہے کہ امریکہ کے یہودیوں اور کیتھولک عیسائیوں میں خاندان کا شیرازہ ابھی تک بکھرنے نہیں پایا۔

دوسری بنیادی چیز عورت کے مقام کا تعین ہے۔ لائف کے مضمون نگار نے انڈیانا یونیورسٹی کے ایک ماہر عمرانیات ڈاکٹر کرک پیٹرک کا ایک تجزیہ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک امریکی عورت کے سامنے تین قسم کی ازدواجی رشتے کے مواقع ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ گھریلو قسم کی عورت بن کے رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی حیثیت محض مرد کے کھلونے کی ہو، وہ اپنی جوانی حسن اور رعنائی کو قائم رکھ کر خاوند اور اس کے دوستوں کو خوش رکھنے کا سامان کرے۔ تیسرے یہ کہ وہ حصہ دار بیوی کا ہی کرے۔ یعنی وہ خود روزی کما کر اپنے اخراجات پورے کرے۔

خاوند کے ساتھ اس کا تعلق محض رفاقت کا ہو۔ اس تقسیم میں دوسری اور تیسری قسم کی عورت کا تعلق اپنے شوہر سے محض برائے نام ہوتا ہے۔ دوسری قسم کی عورت دراصل اپنے شوہر کی ملازم ہوتی ہے جب تک اس کا حسن اور رعنائی باقی رہے۔ اس کی ملازمت کے امکانات بس اسی حد تک برقرار ہیں۔ تیسری قسم کی عورت اپنے اوپر کسی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتی اس لئے

معمولی سے معمولی اختلافات پر وہ اپنا رستہ لیتی ہے۔ صرف پہلی قسم کی بیوی کی حیثیت ایسی ہے کہ نہ مرد اسے آسانی سے چھوڑ سکتا ہے اور نہ وہ خود ہی الگ ہونے میں اپنا مستقبل محفوظ پا سکتی ہے۔ اگرچہ پائیدار شادی کی قسم صرف یہی ہے اور اسی سے مضبوط سوسائٹی تشکیل پا سکتی ہے تاہم امریکہ میں "آزادیٔ نسواں" کے نعرے بلند کرنے والی خواتین اس حیثیت کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں، بلکہ جو عورتیں اس طرح اپنی زندگی گزار رہی ہیں ان کا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتیں۔

ہمارے نزدیک عورت کو اس کے اصل منصب سے ہٹا کر اسے محض تفریح کے لیے بیوی بنانے میں یا پھر اس پر کمانے کی ذمہ داری ڈال دینے میں وہ تمام مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں جن کا نتیجہ کثرتِ طلاق کی صورت میں نکلتا ہے۔ چنانچہ لائف کے اسی شمارے میں با اولاد اور بے اولاد عورتوں کی طلاقوں کی نسبت ایک اور چار بتائی گئی ہے۔ اگرچہ اس کی مزید وضاحت نہیں کی گئی تاہم ہمارا خیال ہے کہ با اولاد عورتیں پہلی قسم سے تعلق رکھنے والی ہوں گی جبکہ بے اولاد سے مراد وہ عورتیں ہیں جن کی شادی کا مقصد گھر گرہستی کی ذمہ داریاں ادا کرنا نہیں بلکہ مرد کا کھلونا یا ساتھی بن کر رہنا ہے۔

پھر مغربی تہذیب کے مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کے فلسفہ کے مفاسد کا ایک اندازہ مذکورۂ بالا مضمون سے ہو جاتا ہے۔ کورٹ شپ کے متعلق یہ دعوےٰ ہے کہ شادی سے پہلے اس مرحلے سے گزرنے کے بعد ہونے والے میاں بیوی ایک دوسرے کی طبیعتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جو شادیاں ہوتی ہیں وہ زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔ لیکن تجربے نے یہ بتایا ہے کہ کورٹ شپ سے اپنے ساتھی کے بارے میں اندازہ غلط ہونے کے امکانات بزرگانِ خاندان کے فیصلہ کی نسبت بے حد زیادہ ہیں۔ اگر کورٹ شپ پائیدار نکاحوں کے وجود میں لانے کا کوئی ذریعہ ہوتا تو امریکہ میں طلاق کی یہ کثرت ہرگز نہ ہوتی۔ کورٹ شپ کا نظری مفہوم اگرچہ یہ ہے کہ کورٹ شپ کرنے والے زن و شو کے تعلقات اس عرصہ میں قائم نہ کریں لیکن عملی طور پر اس کے تقاضے پورے کرنا ناممکن ہے۔ اس معاملے میں انسانی فطرت کو نظر انداز کر کے محض اصول کا سہارا لینا بڑی حماقت ہے۔

مذکورہ بالا مضمون سے شراب نوشی کا ایک ایسا نقصان بھی واضح ہوتا ہے جس کی

طرف عام طور پر لوگوں کی توجہ نہیں ہے۔ مغرب زدہ طبقہ کی نظر میں اصل قدر و قیمت تو مغرب کے طور طریقے کی ہوتی ہے۔ وہ اسلام کی ہر بات میں میخ نکالتے ہیں۔ اسلام نے شراب نوشی سے منع کیا ہے۔ ہمارے مغرب زدہ طبقہ کے نزدیک شراب نوشی کے اجتماعی نقصانات تو سرے سے ہیں ہی نہیں، اس کا اثر محض فرد پر پڑتا ہے اور یہ بھی عموماً اچھا ہی ہوتا ہے کیونکہ آدمی کی صحت کے لئے شراب نوشی مفید ہے اور نشہ کی حالت میں آدمی کی قوتِ کار بڑھ جاتی ہے لیکن طلاق کے اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ تقریباً ایک تہائی طلاقیں محض شراب کے برے اثرات کے تحت واقع ہوتی ہیں۔ گویا شراب سے فرد کی قوتِ کار میں وقتی طور پر چاہے کتنا ہی اضافہ ہو جاتا ہو لیکن دوسرے اجتماعی مفاسد سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف خاندان کے دائرے میں اس کے برے اثرات حد درجہ وسیع ہیں۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کا نظم زیادہ اہم ہے یا افراد کی وقتی لذت کا اہتمام؟ اگر اول الذکر چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے تو شراب نوشی کے قصیدے پڑھنے کے کیا معنی؟

مغربی ممالک میں کثرتِ طلاق کا مسئلہ حد درجہ پریشان کن ہے۔ اس کی حیثیت سوسائٹی کے ایک ناسور کی ہو گئی ہے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ بعض ایسے ممالک جہاں کی روایات اس وبا کو قبول کرنے کے خلاف تھیں، محض تقلیدِ مغرب کے شوق میں کثرتِ طلاق کو بھی ملک میں رائج کر رہے ہیں۔ چنانچہ مصر میں اس کا وہی عالم ہے جو امریکہ میں ہے۔ لائف کے مضمون نگار نے یہ کہہ کر بہت اچھی چوٹ کی ہے کہ لوگوں نے امریکہ کے کوکا کولا، وہاں کی گاڑیوں، ہالی وڈ کی فلموں کو درآمد کیا ہے تو یہاں کے کثرتِ طلاق کے مسئلہ کو بھی انہوں نے امریکہ کے برآمدی مال کا درجہ دے دیا ہے۔ معلوم نہیں "ترقی پسند" لوگوں کو مغرب کی ان اقدار کی نقالی کیوں سوجھتی ہے جن کے مفاسد سے خود اہلِ مغرب پناہ مانگتے ہیں؟

جناب خالد مسعود صاحب

نبی کا فیضانِ نظر

(مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ایک عربی مضمون سے ترجمہ)

درسگاہِ نبوی میں جن لوگوں نے تربیت حاصل کی یا وہاں کے شاگردوں میں سے تھے وہ اس رنگ میں رنگے ہوئے تھے کہ فکرِ آخرت ان پر غالب تھی۔ یہ ان کے اندر اسی طرح جاری و ساری تھی جس طرح روح اور خون جاری ہوتے ہیں۔ ان کے ذہنوں میں اس کا اثر اتنا تھا کہ نہ وہ آخرت کو کبھی بھولتے، نہ اس کا بدل چاہتے اور نہ اس پر کسی دوسری چیز کو ترجیح دیتے۔ اگر آپ درسگاہِ نبوی کے شاگردوں کے اس غالب جذبہ کا مشاہدہ کرنا چاہیں تو اس کے لئے حضرت علیؓ کے اوصاف پر ایک نگاہ ڈالنا کافی ہوگا۔ اسی سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ درس گاہِ نبوی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجہ میں کس قسم کے انسان تیار ہوئے۔

ابوصالح سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہؓ بن ابوسفیانؓ نے ضرار بن ضمرہؓ سے کہا: "میرے سامنے حضرت علیؓ کے اوصاف بیان کیجئے"

ضرار نے کہا: "آپ مجھے اس سے معاف ہی رکھئے"

معاویہؓ نے مزید اصرار کیا: "نہیں آپ ضرور بیان کریں"

وہ کہنے لگے "کیا آپ مجھے اس سے معاف نہیں رکھیں گے؟"

معاویہ نے جواب دیا: "ہرگز نہیں، میں آپ کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا"

اس پر ضرارؓ نے بیان کیا: "خدا کی قسم، حضرت علیؓ نہایت بلند نظر اور مضبوط آدمی تھے۔ بات صاف صاف کرتے تھے اور فیصلہ عدل و انصاف سے کرتے تھے۔ آپ کے پہلوؤں سے علم پھوٹتا

تھا، آپ ہر لحاظ سے حکیمانہ بات کرتے تھے۔ دنیا اور اس کی چمک دمک سے آپ کو نفرت تھی۔ رات اور اس کے اندھیرے سے آپ کو انس تھا۔ خدا کی قسم آپ خدا کے خوف سے بہت رونے والے اور گہری سوچ بچار میں پڑنے والے تھے۔ آپ اپنی ہتھیلی کو الٹا کرتے اور اپنے نفس کو خطاب کیا کرتے تھے۔ آپ کو لباس وہ پسند تھا جو موٹا جھوٹا ہو اور کھانا وہ پسند تھا جو معمولی ہو۔ اللہ کی قسم وہ ہماری ہی طرح تھے۔ جب ہم آپ سے کچھ پوچھتے، آپ اس کا جواب دیتے۔ جب ہم آپ کے پاس حاضر ہوتے، آپ ہمارا استقبال کرتے۔ جب ہم آپ کو بلاتے، آپ بلا تکلف تشریف لے آتے۔ آپ کی اس بے تکلفی اور قرب کے باوجود ہمارا حال یہ تھا کہ ہم نہ ان کی ہیبت کی وجہ سے بات کر سکتے تھے اور نہ ان کی عظمت کی وجہ سے ان کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ آپ جب تبسم فرماتے تو آپ کے دانت ایسے معلوم ہوتے جیسے ایک لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوں۔ اہلِ دین کی آپ عزت کرتے، مساکین سے آپ کو محبت تھی۔ نہ کوئی بااثر آدمی آپ سے کسی باطل میں تعاون کی امید رکھتا تھا اور نہ کوئی بے اثر آدمی آپ کے عدل سے مایوس ہوتا تھا۔ میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں نے آپ کو عبادت میں مصروف دیکھا۔ اس وقت رات نے اپنے پردے ڈال دیئے تھے اور ستارے ڈھل گئے تھے۔ آپ اپنی جائے نماز میں اپنی داڑھی پکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ آپ اس طرح پہلو بدل رہے تھے جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔ اس شدت کا گریہ طاری تھا جیسے کوئی بہت ہی غمزدہ آدمی رو رہا تھا۔ میں ابھی تک گویا انہیں یہ کہتے سن رہا ہوں: "اے دنیا! کیا تو میرے پیچھے پڑ گئی ہے یا تجھے مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟ دفع ہو جا، کسی دوسرے کو جا کر دھوکا دے۔ میں تجھے تین طلاقیں دیتا ہوں۔ اب میں تیری طرف رجعت نہیں کروں گا۔ تیری عمر مختصر اور تیری زندگی حقیر ہے۔ لیکن تیرے ساتھ جو خطرہ وابستہ ہے وہ بہت بڑا ہے۔ ہائے افسوس! زادِ راہ کم، سفر لمبا اور رستہ وحشتناک ہے۔"

ایک دوسری مثال لیجئے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے صحابی کا خطبہ ہے جنہیں اسلامی حکومت کے ایک بڑے دارالخلافہ کا امیر مقرر کیا گیا تھا۔

خالد بن عمیر العدوی سے روایت ہے۔ وہ بتلاتے ہیں کہ بصرہ کے امیر عتبہؓ بن غزوان نے ایک مرتبہ ہمیں خطبہ دیا۔ آپ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔

"دنیا نے منہ پھیر لیا ہے اور بگٹٹ بھاگی جا رہی ہے۔ اب اس کا اسی قدر حصہ باقی رہ گیا ہے جتنا کوئی آدمی برتن سے پانی پی کر ذرا سا تلچھٹ چھوڑ دیتا ہے۔ بلاشبہ تم لوگ دنیا کو چھوڑ کر ایک ایسے گھر کو جانے والے ہو جسے زوال ہرگز نہیں۔ لہٰذا تم وہاں جاؤ تو اچھا توشہ لے کر جاؤ کیونکہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ایک پتھر جب دوزخ کے کنارے سے گرایا جائے گا تو وہ ستر سال میں بھی اس کی تہ کو نہ پا سکے گا۔ اس کے باوجود، خدا کی قسم، دوزخ بھر دی جائے گی۔ کیا تمہیں یہ سن کر تعجب ہوتا ہے؟ تو لو اور سنو۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جنت کے دو پھاٹکوں کے درمیان فاصلہ چالیس سال کی مسافت کا ہوگا لیکن اس کے لئے بھی ایک دن ایسا آئے گا کہ وہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہوگا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنا وہ دن بھی ہے جب ہم سات آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ ہمارے پاس درخت کے پتوں کے علاوہ کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔ پتے کھا کھا کر ہمارے جبڑے زخمی ہو گئے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے ایک چادر حصے میں ملی تو میں نے اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک ٹکڑا میں نے اپنے لئے رکھا اور دوسرا سعید بن مالک کو دیا۔ ان ٹکڑوں سے ہم نے اپنے ازار بنائے۔ خدا کی قسم آج ہم میں ہر ایک کسی نہ کسی شہر کا حاکم ہے۔ میں اس بات سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں کہ خود اپنی نظروں میں تو میں بہت بڑا ہوں لیکن خدا کے ہاں مجھے چھوٹا سمجھا جائے۔ جب کبھی کوئی نبوت ختم ہوئی ہے تو اس کے بعد لازماً ملوکیت کا دور شروع ہو جاتا رہا ہے۔ ہمارے بعد تم لوگ بھی امراء کا تجربہ کرو گے۔" (المسلمون)

مولانا امین احسن اصلاحی کی معرکۃ الآراء تصنیف

تزکیۂ نفس

یا
اسلامی تصوف

اسلام کے طریق تزکیہ علم و عمل کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا ضرور مطالعہ فرمایئے۔

قیمت:۔ حصہ اول — چھ روپے حصہ دوم — چار روپے پچاس پیسے

حصہ سوم — تین روپے پچہتر پیسے (محصول ڈاک علاوہ)

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ میثاق۔ رحمان پورہ۔ اچھرہ۔ لاہور ۱۲

تقریظ و تنقید

(تبصرہ کے لئے کتاب کے دو نسخے بھیجے جائیں۔ ادارہ میثاق ان کتابوں پر تبصرہ کرنا اپنی ذمہ داری نہیں سمجھے گا جن کا صرف ایک نسخہ وصول ہوگا)

تزکیۂ نفس مکمل دونوں حصے

تالیف:۔ مولانا امین احسن اصلاحی

صفحات:۔ ۴۴۰ قیمت:۔ قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم:۔ ساڑھے چار روپے

ناشر:۔ ملک برادرز۔ کارخانہ بازار۔ لائل پور

دین کے نظام میں تزکیۂ نفس کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اندازہ دوسرے علمی دلائل سے قطع نظر اسی حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس کی خاطر تصوف کے نام سے ایک مستقل نظام قائم کر لیا۔ تزکیۂ نفس کی غیر معمولی اہمیت ہی کی بدولت اس نظام کی جڑیں مسلمان معاشرے میں اتنی گہری ہو گئیں کہ صدیوں کے بعد بھی یہ اپنے وجود کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ لیکن تزکیۂ نفس کا مفہوم کیا ہے اور اس کے حدود کار کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہمیشہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے۔ اس مسئلہ پر صحیح دینی نقطۂ نظر پیش کرنے والی کتابیں اگرچہ ناپید نہیں لیکن بہت کم ہیں اور ہمارے زمانے میں زیر نظر تالیف کے علاوہ کوئی کتاب اس موضوع پر ضمیر بلکل نہیں گئی۔

اس کتاب کے لکھنے سے محترم مؤلف مدظلہٗ کے سامنے جو مقصد رہا ہے وہ انہی کے الفاظ میں اس طرح بیان ہوا ہے:

"میں نے اس کتاب میں ان لوگوں کی رہنمائی کرنے کی کوشش کی ہے جو اپنے نفس کی اصلاح و تربیت کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے تزکیۂ نفس کے وہ

اصول و مبادی انشاء اللہ سامنے آجائیں گے جو کتاب و سنت میں بیان ہوئے ہیں اور ساتھ ہی وہ بہت سی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی جو غلط قسم کے تصوف کی راہ سے ہمارے اندر پھیل گئی ہیں۔"

اس کتاب کا اسلوب تمام تر علمی ہے۔ اس کے صفحہ صفحہ سے دین کی عبادات اور تعلیمات کی حکمت واضح ہوتی ہے۔ غور و فکر کے ساتھ اس کتاب کو پڑھنے والا قدم قدم پر یہ محسوس کرتا ہے کہ صاحب کتاب نے ایک بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مؤلف محترم مدظلہ نے کتاب کا علمی پایہ اس کے دیباچہ میں بدیں الفاظ پیش فرمایا ہے۔

"فکری اعتبار سے یہ کتاب میرے دینی فکر کا لب لباب ہے۔ برسوں کے غور و مطالعہ سے دین و شریعت کی جو روح میری سمجھ میں آئی ہے اس کا ایک حصہ میں نے ان اوراق میں الفاظ کے جامہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔"

جب تزکیہ نفس کا لفظ سامنے آتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ اس کتاب میں اسی طرح کی روایتی باتیں درج ہوں گی جس طرح کی باتیں صوفیاء کے ہاں بتائی جاتی ہیں۔ لیکن اس کتاب میں تزکیہ نفس کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس سے علم و عمل دونوں کا تزکیہ مراد لیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں اس کی وضاحت کر دی گئی ہے

"اس کتاب میں ایک خاص چیز جو ہر پڑھنے والا پہلی ہی نظر میں محسوس کرے گا وہ یہ ہے کہ میں نے تزکیہ کو زندگی کے تمام اطراف پر حاوی کر دیا ہے۔ تصوف میں تزکیہ زندگی کے ایک نہایت محدود گوشہ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن کتاب و سنت میں جس تزکیہ کا بیان ہے وہ ہماری زندگی کے ہر گوشے سے بحث کرتا ہے۔ اس سے میری مراد صرف انفرادی زندگی ہی کا ہر گوشہ نہیں ہے بلکہ اجتماعی زندگی کا بھی ہر گوشہ ہے۔"

تزکیہ نفس کے اس تصور کے تحت زیر نظر کتاب کے مباحث کی وسعت کا اندازہ اس کے چند اہم عنوانات سے ہو سکتا ہے جو یہ ہیں۔

دین میں تزکیہ نفس کی اہمیت اور اس کی عمومی ضرورت —— تزکیہ کا لغوی مفہوم،

اس کا مقصد اور اس کی وسعت —— تزکیہ علم —— خدا کی معرفت کے بارہ میں صحیح مسلک —— تدبر قرآن —— اسوہ حسنہ —— منصب رسالت سے متعلق چار بنیادی غلط فہمیاں —— نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت —— حجابات علم —— آفات علم —— ان کا علاج —— تزکیہ عمل —— نماز —— انفاق —— روزہ، حج کی برکات اور آفات، آفات کا علاج۔ گویا اس کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف فکر و نظر اور عمل سے تعلق رکھنے والی بیماریوں کی نشاندہی ہوتی ہے بلکہ ان بیماریوں کی بیخ کنی کے طریقے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح آدمی نہ صرف اس کتاب کی روشنی میں اپنے علم و عمل کا محاسبہ کر سکتا ہے بلکہ ان کی صحیح تربیت کی راہیں بھی متعین کر سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے بیحد مفید ہے۔ یہ کتاب مجلد ہے۔ اور ناشر کے علاوہ مکتبہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے بھی مل سکتی ہے (رخ۔م)

ISLAM AND THE WORLD

تالیف :- مولانا ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ :- ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

صفحات :- ۱۹۲ — قیمت چار روپے

ملنے کا پتہ :- الفادر ناشرین کتب اسلامی ام ایمپریس روڈ لاہور ۵

مسلمانوں کا عروج و زوال اور دنیا پر اس کے اثرات کے موضوع پر محترم مصنف کی یہ کتاب علمی حلقوں میں جانی پہچانی ہے۔ اس کے عربی اور اردو ایڈیشن کئی سال پہلے چھپ چکے ہیں۔ اب اس کا انگریزی ترجمہ "اسلام اینڈ دی ورلڈ" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر قدوائی صاحب کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انہوں نے بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ اسے نبھایا ہے۔ زبان کی خوبصورتی اور دلآویزی دونوں اس میں پائی جاتی ہیں۔

اس کتاب کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل کی دنیا کے مذہبی، فکری، سیاسی اور اقتصادی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اس وقت آسمانی ہدایت کے لئے دنیا کس قدر پیاسی تھی۔ اس پیاس کو بجھانے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت پوری طرح کامیاب رہی۔ بعثت کے تذکرہ کے بعد غیر امت

دورِ عروج اور پھر زوال کے وہ اثرات بتائے گئے ہیں جو دوسری قوموں پر مترتب ہوئے۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد تہذیبِ مغرب کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ چنانچہ محترم مصنف نے تہذیبِ مغرب کی ماہیت اور انسانیت پر اس کے اثرات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ دنیا کسی بے خدا نظام سے نہیں بلکہ صرف اسلام سے مطمئن ہو سکتی ہے۔ یہ تمام بحثیں بڑی مدلل، معلومات افزا اور اثر آفریں ہیں۔ محترم مصنف نے دوسرے اہلِ قلم کے حوالے بھی کثرت سے دیئے ہیں۔

انسانی کردار پر اسلام کے اثرات دکھانے کے لیے چند مسلمانوں کی عملی زندگی کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ بڑی مؤثر اور مادہ پرستی کے اس دور کے خود غرض انسانوں کے لئے بڑی سبق آموز ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں دنیا کی مشکلات کا حل مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کو بتایا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں مسلمانوں کے طرزِ عمل کی نباضی کی اس سے زیادہ ضرورت تھی جتنی محترم مصنف نے کی ہے۔ یہ باب مسلمانوں کی گراں خوابی کے لئے صدائے کوس کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں جس قدر تفصیل سے کام لیا جاتا اتنا ہی اچھا ہوتا۔

محترم مصنف نے مسلمانوں کے دورِ انحطاط کی جو تصویر پیش کی ہے، اس سے تبصرہ نگار کو تھوڑا سا اختلاف ہے۔ مصنف محترم نے خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے فوراً بعد اسلام اور اسلامی حکومت کی جو حالتِ زار پیش کی ہے، امرِ واقعہ شاید یہ نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اسلام نے ان تمام نظامہائے زندگی کی نسبت جو دنیا میں رائج ہو سکے ہیں، اجتماع پر سب سے زیادہ پائیدار اثر ڈالا اور صحابہ کے بعد کئی نسلوں تک معاشرہ پر اسلام کے اثر کی بدولت خلفاء کو کھلم کھلا مادیت پھیلانے کی مدتوں جرأت نہیں ہوئی۔ محترم مصنف نے حکومتوں کے خلاف حق پسند علماء کی بغاوتوں کا جو تذکرہ کیا ہے، ہمارے نزدیک اس میں بھی اختلاف کی گنجائش ہے۔ جن لوگوں نے قائم حکومتوں کے خلاف مسلح بغاوتیں کی ہیں کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ان کے اس طرزِ عمل کو حق بجانب ٹھہرانا ممکن نہیں۔ اس ضمن میں یہ مشاہدہ بھی خاصا تعجب خیز ہے کہ ان بغاوت کرنے والوں میں ان لوگوں کے نام نہیں آتے جو امت کے مصلحین کے نام سے معروف ہیں۔

البتہ یہ بات اس حد تک درست ہے کہ علمائے حق نے دین کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی قربانیاں دیں۔ انہوں نے خلفائے وقت پر بے باکانہ تنقید کرنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایسی شاندار روایات قائم کی ہیں کہ امت کبھی ان کے احسان فراموش نہ کر سکے گی۔ یہ تو ہمارے زمانہ کی بدقسمتی ہے کہ بعض لوگ ان بزرگوں کی اشاعتِ علم و فن کی کوششوں کی تہ میں بھی سیاسی انقلابات کے محرکات ثابت کرنے کے درپے ہیں۔

انگریزی ایڈیشن کی اس اشاعت نے ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب غیر مسلموں کو اسلام سے روشناس کرانے کے لئے اور خود مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں کا احساس دلانے کیلئے بیحد مفید ہے۔ ترجمہ میں دو تین جگہ فاضل مترجم کی فروگذاشت کی وجہ سے محترم مصنف کا نقطۂ نظر سمجھنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ان مقامات کی طرف دوسرے اہلِ علم اشارہ کر چکے ہیں۔ (خ۔م)

• جارحانہ فرقہ پرستی • فسادات جبلپور و ساگر

ترتیب: ابوالنعیم وحید حیدرآبادی

ملنے کا پتہ: مکتبہ البلال مسجد عبداللہ الہ آباد نمبر ۲ (بھارت) یا مکتبہ چراغ راہ، اسٹریچن روڈ، کراچی

یہ دونوں کتابیں جن کی ضخامت علی الترتیب ۲۴۰ اور ۲۰۰ صفحات اور قیمت اڑھائی روپے اور دو روپے ہے۔ ان فسادات کی روداد پر مشتمل ہیں جو پچھلے ڈیڑھ سال کے عرصہ میں جبل پور، ساگر، علی گڑھ، میرٹھ، ہاپوڑ وغیرہ میں ہوئے اور جن میں ملک کی اکثریت نے ایک بنے بندھے منصوبے کے تحت مسلمان اقلیت کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا۔ ان کتابوں کی ترتیب اس طرح رکھی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے فسادات کے تفصیلی واقعات کی مختلف رپورٹیں بھی آجاتی ہیں اور ملک کے اکابرین، حکومت، پارلیمنٹ اور صحافت سب کا ردِ عمل بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان فسادات کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا مواد ان مختصر کتابوں میں مل جاتا ہے۔ یہ کتابیں اگر بھارت کے مسلمانوں میں ایسے حالات کے جرأت مندانہ مقابلہ کا ردِ عمل پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمارے خیال میں یہ ایک عظیم مقصد ہے جو ان سے پورا ہوگا۔

فسادات جبل پور و ساگر پر اسی نوعیت کی انگریزی کتاب THE HOLOCAUST OF JABALPUR AND SAGAR مرتبہ حکیم محمود حسن بھی مذکورہ بالا پتہ سے مل سکتی ہے اور اس کی قیمت سوا روپیہ ہے۔

اعجاز القرآن

تصنیف :- محمد افضل شریف

ضخامت :- ۱۰۴ صفحات　　　قیمت :- حسبِ استطاعت

ملنے کا پتہ :- محمد افضل شریف ۴۸ اپنشن لین - یوپی - حیدرآباد دکن (انڈیا)

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد قرآن مجید کی عظمت و شان بیان کرنا ہے۔ اس کے اہم ترین ابواب دو ہیں۔ ایک مذاہب عالم کی اہم کتابوں میں نزولِ قرآن مجید کی پیشین گوئیاں اور دوسرے قرآن کی خصوصیات۔ اول الذکر باب میں مصنف نے مشہور مذہبی کتابوں کے بے شمار حوالے دے کر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تمام کتابیں خدا کی آخری کتاب کی نوید سناتی چلی آئی ہیں۔ کتاب کے اس حصے سے اچھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ثانی الذکر باب میں قرآن مجید کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں ان میں دلچسپ نکات تو کافی ملتے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک اس طرح کی تحقیقات کی نہ کوئی خاص ضرورت ہے اور نہ ان سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ آیات کے الفاظ کی کھینچ تان کر کے ہم قرآن مجید سے علم حساب، علم الجبرا، علم جیومیٹری وغیرہ کا وجود ثابت بھی کر لیں تو اس میں قرآن مجید کی خدمت کا کون سا پہلو پیدا ہوتا ہے۔ قرآن جس بات کا خود دعوٰی ہی نہیں کرتا اس کے اثبات کے لئے آیات کی کھینچ تان کرنا اور قرآن میں خودساختہ قسم کا اعجاز ثابت کرنا ہمارے نزدیک دانش مندی کی بات نہیں۔

کتاب کی باقی تمام بحثوں کی افادیت اور ان کا باہمی ربط تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ بحثیں اعجازِ قرآن کے موضوع سے کس طرح متعلق ہیں؟ یہ جاننے کے لئے قارئین کو شاید مصنف کی طرف رجوع کرنا پڑے۔

ادارہ پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق مدھان پورہ، اچھرہ لاہور سے شائع کیا